ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ندائے اعتدال

اکتوبر ۲۰۱۴ء

ایڈیٹر
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	انسانیت کو تباہی سے بچانے کا نسخہ	سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	
۲۔	اداریہ	امانت وخیانت	مدیر	۳
۳۔	گوشۂ سیرت	اسلام انا دورائی کی نظر میں	تحریر: مسٹراڈیار، مترجم: ایم،اے، جمیل احمد	۷
۴۔	عید الأضحیٰ	قربانی کی حقیقت ومسائل	کلیم اللہ عمری مدنی	۱۱
۵۔	بحث و تحقیق	شہریت کا مسئلہ	محمد قمر الزماں ندوی	۱۵
۶۔	// //	فتنۂ وضع حدیث کے اسباب	محمد فرید حبیب ندوی	۲۳
۷۔	اسلامی تعلیمات	معاشرتی مسائل کے نمایاں عناصر	محمد فرمان ندوی	۲۹
۸۔	// //	عقیقہ کے شرعی احکام	محمد قمر الزماں ندوی	۳۷
۹۔	تربیت اولاد	اپنی ذات اور جذبات کے تئیں بچے کا احساس	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۴۵
۱۰۔	دردِ دل	لہولہان فلسطین کا پیغام مسلمان حکمرانوں کے نام	مفتی احتکام الحق قاسمی	۵۰
۱۱۔	// //	عالم اسلام کی بے حسی......تم مسلمان ہو؟......	محمد سراج الہدیٰ ندوی ازہری	۵۳
۱۲۔	تجزیہ	فلسطین میں کس کی جیت	احمد جاوید	۵۷
۱۳۔	تصویر وطن	لو جہاد: کیا حقیقت کیا سراب	شمس تبریز قاسمی	۶۰
۱۴		ادارے کے شب وروز	ادارہ	۶۳
۱۵	آخری صفحہ	سرسید احمد کی اسلامی غیرت	م۔ق۔ن	۶۴
۱۶	شعر و ادب	نعت	رئیس الشاکری	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

امانت و خیانت

امانت خیانت کی ضد ہے، کمالِ ایمان کی علامت ہے، مسلمان کے کردار کا حسن ہے، اسلامی چہرہ کا نکھار ہے، آسمان وزمین کا نظام اسی پر قائم ہے، امانت دین کا محور بھی ہے اور رب العالمین کی طرف سے بڑا امتحان بھی، امانت کے ذریعہ دین وایمان، علوم ومعارف اور مال ودولت، عزت وناموس اور شہادت وقضا سب کا حق ادا کیا جاسکتا ہے اور سب کی حفاظت بھی ممکن ہے، مومن کی صفاتِ قرآنیہ اور مومن کے اعلیٰ اخلاق میں اس کا شمار ہے، والذین هم لإماناتهم و عهدهم راعون (مومنون:۸)(ترجمہ: اور جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں)

جو انسان صفت امانت سے آراستہ ہوتا ہے وہ لوگوں کی نظر میں محبوب اور اللہ کا چہیتا بن جاتا ہے، دنیا اسے تسلیم کرتی ہے، اور اللہ کا اسکو قرب حاصل ہوتا ہے، جس معاشرہ کی تعمیر میں امانت کا کردار ہوتا ہے اور یہ بیش بہا و پرکشش صفت رواج پاتی ہے وہ معاشرہ مامون ہوتا ہے، امن وامانت کا لفظی رشتہ معاشرہ کو معنویت کا ایسا حسین پیکر عطا کرتا ہے کہ دنیا حیرت واستعجاب کا مجسمہ بن جاتی ہے، اور پھر اس معاشرے کی کشش لوگوں کو اس کا گرویدہ بناتی ہے، **جس ادارے میں امانت داری کا چلن ہوتا ہے، اس کے لیے ترقی کی راہیں کھلتی ہیں، وہ ملت کے کام کا بنتا ہے اور پروان چڑھتا ہے، وہ باعث خیر وبرکت ہوتا ہے وہاں کے کارکنوں میں احساس ذمہ داری کی جھلک نظر آتی ہے، وہاں سے صاحب استعداد نکلتے ہیں اور اصحاب استعداد کو وہاں جگہ ملتی ہے، خود یہی دونوں چیزیں امانت داری کی بڑی دلیل ہیں**، امانت مسلمانوں کے معاشرہ کی پہچان تھی، کیوں کہ مسلمانوں کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ نے مسلمانوں کی تربیت میں اس عنصر کو اس طرح شامل کر دیا تھا کہ ان کا معاشرہ مامون ہو گیا تھا، گھر گھر امن تھا، گلی گلی میں سلامتی کا پہرہ تھا، بھائی بھائی سے مطمئن تھا، رعایا حکام سے خوش تھے، ہر صاحب حق کو اپنا حق ملنے کا یقین کامل تھا، خود آپؐ قبل بعثت صادق وامین کے لقب سے شہرت پا چکے تھے، ہجرت کے بعد جب آپ مدینہ میں قیام پذیر تھے تو متعدد ایسے واقعات مفسرین نے بعض آیات کے ضمن میں نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو حضورؐ کی امانت و دیانت پر اپنے بغض وعناد کے باوجود کس قدر اعتماد تھا کہ باوجود اپنی تمام تر سازشی ذہنیت اور اسلام دشمنی کے اپنے مقدمات کا فیصلہ کرانے رسالت مآبؐ کی عدالت میں آتے تھے کیوں ان کو کہ یہ اعتماد ہوتا تھا کہ یہاں بتقاضۂ امانت انصاف ہی انصاف ہوگا، اسی امانت کے لئے تو حضورؐ نے آخری درجہ کی یہ بات ارشاد فرمادی لا ایمان لمن لا امانة له و لا دين لمن لا عهد له ''جسمیں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں اور جو پابندیِ عہد کا خوگر نہیں

اس میں دین نہیں‘‘ (مسند احمد ر ح ۱۲۵۶۷ ر ج ۲۰)

<u>**عام طور پر امانت وخیانت کا تصور صرف مالی معاملات تک محدود ہے**</u>، کسی شخص کا مال ہو یا ملت کا اس میں خرد برد کی گئی تو اس میں کیا شک کہ امانت کا جنازہ نکال دیا گیا اور خیانت کی اعلیٰ مثال قائم کی گئی، اس سے بڑھ کر بے شرمی اور کیا ہوگی کہ کسی نے اپنے مال کا امین بنایا یا کسی ادارے نے مالی ذمہ داری دی اور اسمیں خیانت کا ارتکاب کیا جائے؟؟ <u>**لیکن غور طلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے امانت کو بہت وسیع مفہوم میں ذکر کیا ہے**</u>، جس کا اظہار خود اس سے ہوتا ہے کہ بعض جگہوں پر قرآن نے لفظ امانت کو جمع کے صیغہ سے ذکر کیا ہے مثلاً ارشاد ہے، یا أیھا الذین آمنوا لا تخونوا الله والرسول وتخونوا اماناتکم (انفال:۲۷) (ترجمہ: اے ایمان والوں جان بوجھ کر اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو، اور اپنی امانتوں میں بھی غداری کے مرتکب نہ ہو) اور فرمایا: ان الله یأمرکم ان تودو الامانات إلی أھلھا (نساء:۵۸) (ترجمہ: اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کردو)

امانات جو جمع کا صیغہ ہے اس سے صاف وضاحت ہوتی ہے کہ امانت کی بہت سی قسمیں ہیں، مال کی امانت تو اقسام امانت میں سرفہرست ہے، ابن سعد سے جو روایت مفسرین نے ثانی الذکر آیت کے شان نزول کے طور پر نقل کی ہے اسمیں عثمان بن طلحہ کو فتح مکہ کے موقع پر خانۂ کعبہ کی کنجی دینے کا واقعہ ہے، ظاہر ہے کہ خانہ کعبہ کی کنجی کا کوئی تعلق مال سے نہ تھا لیکن تھی وہ امانت جبکہ رسولؐ نے فتح مکہ کے موقع پر جب اس کو لیا تھا تو اب آپؐ کو کلی اختیار حاصل ہو چکا تھا، لیکن حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے آپؐ نے کنجی ان کو واپس کی، حضرت عمر بن الخطاب کی روایت ہے کہ اس روز جب آپ خانۂ کعبہ سے باہر تشریف لائے تو آپ کی زبان پر یہی آیت جاری تھی اس سے پہلے میں نے آپ سے یہ آیت کبھی نہیں سنی تھی، اسی آیت کی تعمیل میں آپ نے کنجی عثمان بن طلحہ کو واپس کی۔

چنانچہ امانت کا مفہوم اور اس کے تقاضے بہت وسیع ہیں، امانت کی جو تعریفیں کی گئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کا اپنے آپ کو ناحق سے بچانا امانت داری ہے، دوسروں کو ان کا حق پہنچانا امانت داری ہے اور جس چیز کو بحیثیت امانت سپرد کیا جائے اس کی بھرپور حفاظت کرنا اس میں تفریط سے بچنا اور اس کی حفاظت و ادائیگی کے لیے اہتمام کرنا بھی امانت داری ہے، اسی لیے امام ابن الجوزی نے بعض مفسرین سے نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ امانت کو قرآن نے تین مفہوم میں ذکر کیا ہے، چنانچہ امانت سے مراد فرائض ہیں، ارشاد ہے یا أیھا الذین آمنوا لا تخونوا ...... خود امانت کی تعریف میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ہر چیز جو اللہ نے بندوں پر فرض کی ہے اس کی ادائیگی امانتداری ہے، دوسرے معنی ودیعت کے ہیں، کہ جو چیز بھی ایک انسان دوسرے کو دے اور بطور امانت کسی پاس رکھے اس کو ویسے ہی واپس کرنا امانت داری ہے، ارشاد باری ہے ان الله یامرکم ان تؤددوا، تیسرے معنی پاکدامنی کے ہیں، ارشاد ہے: ان خیر من استاجرت القوی الأمین (قصص:۲۶) (ترجمہ: بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہوسکتا ہے جو مضبوط اور امانتدار ہو)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امانت کا لفظ زندگی اور اس کے سبھی پہلوؤں پر حاوی ہے، دین، ایمان، فرائض و

واجبات، عزت وعصمت، جسم وروح، علوم ومعارف، شہادت وقضاء، دفتر وملازمت، نقلِ روایت اور راز داری اور حواس خمسہ وغیرہ سب امانت میں شامل ہیں، ان کا صحیح استعمال امانتداری ہے، اوران کا غلط استعمال امانت داری کے خلاف ہے، قرآن کی تعبیر دیکھیے ان خیر من استاجرت القوی الامین ، جس کو آپ کسی کام کے لیے منتخب کریں اس میں کمال حسن امانتداری کا وجود ہے، کہ یہی ترقی کی ضمانت ہے، عہدے ومناصب سب امانت ہیں، ان کا غلط استعمال خیانت ہے اور خیانت نفاق کی علامت ہے۔

لفظ خیانت بھی کئی معنی میں قرآن میں مستعمل ہے اس کا مطلب ہے امانت داری کا دامن چھوڑ دینا، معصیت بھی خیانت ہے، نقض عہد وپیمان بھی خیانت ہے، دین میں مخالفت بھی خیانت ہے، امام راغب اصفہانی خیانت ونفاق کو ایک ہی شمار کرتے ہیں، خیانت کمزوریٔ ایمان پر دلالت ہے، خیانت سراپا ظلمت اور باعث ظلمت ہے، بے انصافی کو جنم دیتی ہے معاشرے میں فساد پھیلاتی ہے، اداروں کی جڑوں کو کھوکھلا کرتی ہے، نا اہلوں کو عہدے سپرد کرتی ہے، جو اہل ہوں ان کے حقوق غصب کرتی ہے، خیانت حاسدین اور نفرت کرنے والوں کے ساتھ چاپلوسوں میں اضافہ کرتی ہے، خیانت سے برائی عام ہوتی ہے، کمزوری لاحق ہوتی ہے، پھر اسی کمزوری کے سبب ماتحتوں میں خیانت رواج پاجاتی ہے، پھر قوت ارادی ختم ہوجاتی ہے، قوت فیصلہ کمزور ہوجاتی ہے، اقدام سے خوف ہوتا ہے، کچھ کر گزرنے کا جذبہ سرد پڑجاتا ہے، خیانت دانستہ ونادانستہ دونوں طرح ہوتی ہے، **لیکن افسوس اس پر ہے کہ امانت کے وسیع مفہوم سے واقف لوگ بھی عہدہ ومناصب، حصولِ راتب ومراتب اور رواشتوں کے بچانے میں اہل ونااہل کی تمیز نہیں کرپاتے، دنیا کی مصلحتیں، گردو پیش کا ماحول ومنظر نامہ، قربتوں کے تقاضے جانے انجانے میں کتنی خیانتوں کے ارتکاب کا سبب بن جاتے ہیں، ہمارے لیے اس کا اندازہ کرنا بھی ممکن نہیں**، اس امت کو جو امانت سونپی گئی اس میں خیانت کے باعث یہ جس حال میں ہے اس سے ہر صاحب حس مضطرب ہے، اور جس میں حس نہیں اسے سب ہرا بھرا نظر آتا ہے، حکمراں کھلے طور پر خائن نظر آتے ہیں، **اسلامی حکومتوں کا ڈھونگ رچنے والوں پر خیانت کی ساری قسمیں منطبق ہوتی ہیں بلکہ قرآن کے بیان کردہ منافقانہ کردار ان میں خوب نظر آتے ہیں، ان کی خیانتوں کی تصدیق کرنے والے اور دشمنوں سے مل کر اسلام پسندوں کے خلاف ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے علماء بھی خائن اور ان کی خیانتوں میں برابر کے شریک ہیں، اسلامی تحریکات کو کالعدم قرار دیا جارہا ہے، اسلام پسندوں کو دہشت گرد کہا جارہا ہے، اسلام کی چاہت رکھنے والے مشکوک بتائے جارہے ہیں، اپنی اپنی مصلحتوں کے سبب علماء اپنے حکمرانوں اور قوموں کے لئے قرآن وحدیث کے علم میں خیانت کا ارتکاب کررہے ہیں۔**

حد تو یہ ہے کہ اسلام وملت کے نام پر وجود میں آنے والے بے شمار اداروں میں اس طرح کی بہت سی خیانتیں جگہ پاتی ہیں، کچھ نہیں تو محض تعلقات کے سبب نا اہلوں کو اچھے اچھے مناصب دیے جاتے ہیں اور اس وقت نظروں سے یہ بھی اوجھل ہوجاتا ہے کہ حدیث میں کسی منصب پر نا اہل کو بٹھانے والا ملعون قرار دیا گیا ہے، اسی طرح کی خیانتوں کا مجموعہ ان اداروں کے روبہ زوال ہونے کا سبب بن جاتا ہے اخلاقی، فکری، علمی انحطاط روزافزوں نظر آتا ہے، اس انحطاط

کارونا سب روتے ہیں لیکن اس کے درپردہ خیانت کا یہ مہلک عنصر کسی کو نظر نہیں آتا اور اگر اس کا علم ہو بھی تو بتقاضۂ مصلحت اس کی نشاندہی نہیں کی جاتی، جواز خود خیانت ہے، دفتری کاموں میں سستی، ملازمت کا حق ادا نہ کرنا، اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرنا، اپنے ذمہ کاموں میں ٹال مٹول کرنا یہ سب خیانت کا حصہ ہے، غرض خیانت ایک گھن ہے جس شخص کو لاحق ہوجائے اسے بے کیف و بے نور بنادیتا ہے اس کے دل ودماغ کو چاٹ کر ختم کردیتا ہے، جس ادارے میں اس کا رواج ہوجائے وہاں پھر صاحب استعداد کا جگہ پانا اور اصحاب استعداد طلبہ کا نکل پانا بہت مشکل ہے، اس لیے کہ اساتذہ کی تدریس امانتداری چاہتی ہے، اساتذہ کی تقرری امانتداری کی متقاضی ہے، اساتذہ میں کتابوں اور ذمہ داریوں کی تقسیم امانتداری کا تقاضہ کرتی ہے، یہ تاویل ممکن ہے کہ جب پوری اہلیت اور تمام شرائط کا جامع میسر نہ ہوتو افضل الموجود کا انتخاب ہوتا ہے، لیکن آنکھیں اس تاویل کے خلاف دن رات افضل الموجود کو ٹھکانے لگانے، اس سے چشم پوشی برتنے اور محض ادنیٰ اغراض اور رکیک مقاصد یا رشتہ وقربت کے سبب اس کو کنارے کرنے کا مشاہدہ کرتی ہیں، طلبہ کی علمی وفکری تربیت اور ادارے سے مخلصانہ تعلق امانتداری کے سبب ہی ممکن ہے، **جب ان بنیادی چیزوں میں خیانت اس طرح رائج ہو کہ اس کے خیانت ہونے کا تصور بھی ذہن سے نکل جائے تو زوال یقینی ہے، اس لیے کہ خیانت اللہ کے غضب کی موجب ہے، خیانت معاشرے، ادارے اور امت میں انتشار کا باعث ہے، حکومتیں خیانت کرتے کرتے کفر والحاد کی ہم پیالہ وہم نوالہ بن گئی ہیں، اسلام اور شریعتِ اسلام سے محبت ان کی نظر میں سب سے بڑا جرم قرار پاتا ہے، یہودنوازی کو سیکولر کردار کا نام دیا جاتا ہے، حرمین کی خدمت نفاق کا خوبصورت غلاف بن گئی ہے، ادارے تعلقات اور مصلحتوں کی رو میں بہتے بہتے صلاحیت مند لوگوں سے خالی ہوگئے ہیں**، ان کے ماضی وحال میں کوئی مماثلت نظر نہیں آتی اسباب کچھ بھی ہوں لیکن سببِ اصلی کے طور پر یہی خیانت رقص کرتی نظر آتی ہے۔

امانت کی عادت ڈال کر، اس قرآنی صفت سے متصف ہو کر اور اس کے وسیع تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر ہی اپنی، اپنے گھر کی، اپنے ادارے اور اپنی ملت کی اصلاح ممکن ہے، ورنہ نااہلی فروغ پائے گی، نااہلوں کا دوردورہ ہوگا، نااتفاقیاں وجود میں آئیں گی، قومی اثاثے غیر محفوظ ہوں گے، ملت روز بروز کمزور ہوگی اور ہر شام صفِ ماتم بچھے گی ہر صبح نوحہ کناں ہوگی، زندگی کے اس تلخ موڑ پر کھڑے ہو کر بس یہی نظر آتا ہے کہ ہر شخص حکمراں سے رعایا تک، طلبہ سے اساتذہ تک، والدین سے بچوں تک ذمہ داروں سے ماتحتوں تک سب اپنی اپنی جگہ پر امانت کے وسیع مفہوم کو سامنے رکھ کر اپنا احتساب کریں اور حتی الامکان اعلیٰ اور نبوی اخلاق کی اس علامت پر عمل کرنے اور عام کرنے کی کوشش کریں، بہت امکان ہے کہ پھر ملت کا بیمار جسم تروتازہ ہوجائے اور پھر سے ملت کا مستقبل شاداب ہو۔ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہر وقت دعوتِ احتساب دیتا ہے لقد انزلنا إليكم كتابا فيه ذكركم أفلا تعقلون۔ (انبیاء:۱۰) (ترجمہ: ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جسمیں تمہارا ہی تذکرہ ہے کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔)

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

گوشۂ سیرت

(قسط-۹)

’’اسلام- جس سے مجھے عشق ہے‘‘

اسلام-انادورائی کی نظر میں

تحریر: مسٹر اڈیار | ترجمہ: ایم اے جمیل احمد

سابق وزیر اعلیٰ ٹامل ناڈو انادورائی(۱) نے ۷/اکتوبر ۱۹۵۷ء میں سیرت کے موضوع پر ایک تقریر کی تھی جسے یہاں پیش کرنا مفید رہے گا۔ اپنی تقریر میں مسٹر انادورائی نے کہا تھا کہ:

’’اسلام کے اصول وقواعد کی جتنی ضرورت چھٹی صدی میں دنیا کو تھی اس سے کہیں بڑھ کر ان کی ضرورت آج کی دنیا کو ہے جو مختلف نظریات کی کھوج میں ٹھوکریں کھا رہی ہے اور کہیں بھی اسے چین نصیب نہیں ہوسکا۔

اسلام محض ایک مذہب نہیں ہے بلکہ وہ ایک نظریۂ حیات اور بہترین نظامِ زندگی ہے۔ اس نظامِ حیات کو دنیا کے کئی ممالک اختیار کیے ہوئے ہیں۔

میرے اپنے مذہبی خیالات اور سیرت کے اس جلسہ میں میری شرکت کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسلام کو ایک نظامِ حیات جان کر ہی میں اس جلسہ میں شریک ہوا ہوں۔

اسلامی نظریۂ حیات اور اسلامی نظامِ زندگی کے ہم کیوں مداح ہیں؟ صرف اس لیے کہ اسلامی اصولِ حیات انسانی ذہن میں پیدا ہونے والے سبھی شکوک وشبہات کا جواب احسن طریقہ سے دیتے ہیں۔

نبی کریمؐ کی تعلیمات میں سرِ فہرست یہ تعلیم ہے: ’’خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔‘‘ اس تعلیم کی میں دل سے قدر کرتا ہوں اور تحسین کی نظروں سے دیکھتا ہوں۔

اس تعلیم کی قدر اتنی کیوں کی جائے؟

اس لیے کہ یہ تعلیم انسانی فکر کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور سوچنے پر ابھارتی ہے۔

خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ کیوں نہ کیا جائے؟ خدا کی ذات وصفات کیا ہیں؟ انسان کے لیے ان تمام مسئلوں پر سوچنے کا سامان یہ تعلیم مہیا کرتی ہے۔ ایک ٹمل دانشور شاعر نے کہا ہے:

جس نے دیکھا اس نے پایا نہیں
جس نے پایا اس نے دیکھا نہیں
جس نے دیکھا اس نے کہا نہیں
جس نے کہا اس نے دیکھا نہیں

خدا کی صفات لامتناہی ہیں۔ اس میں کھو جانا اور مسلسل اس

---

(۱) مسٹر انادورائی D.M.K. کے بانی تھے۔ وہ D.M.K. حکومت کے پہلے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے تھے۔ وہ ایک سیاست داں ہی نہیں دانشور بھی تھے D.M.K. اور D.M.K.(A.I.) کے حلقوں میں ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔

میں آگے بڑھنا ہی کمال ہے۔

خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی کو ہم خدا کا ہمسر قرار دیں۔

خدا کا شریک کون ہوسکتا ہے؟ اس لیے نبی کریمؐ نے شرک سے منع فرمایا ہے۔

دیگر مذاہب میں شرک کی تعلیم کی اجازت ہونے سے ہم جیسے لوگ مختلف نقصانات کا شکار ہوئے ہیں۔شرک کی راہوں کو مسدود کرکے اسلام انسان کو بلندی اور رفعت عطا کرتا ہے اور پستی اوراس کے ہولناک نتائج سے نجات دلاتا ہے۔

دین اسلام انسان کو کامل اور اچھا انسان بناتا ہے۔خدا نے جن بلندیوں تک پہنچنے کے لئے انسان کو پیدا کیا ہے ان رفعتوں کو پانے اور ان تک اوپر اٹھنے کی طاقت و صلاحیت انسان کے اندر اسلام کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔

خدا خود ظاہر ہوکر ''مجھے خدا مان لے'' یہ حکم انسان کو دے سکتا تھا۔اس صورت میں انسان کے لیے اپنی قوتِ فکر سے کام لینے کا کوئی موقع باقی نہ رہتا۔اس طرح انسان کی فکری قوت کو سخت صدمہ پہنچتا اور انسان ذہنی وفکری ارتقاء سے محروم رہ جاتا۔لیکن نبی کو بھیج کر ان کے ذریعہ سے جب خدا نے یہ پیغام دیا کہ ''یہ میری طرف سے بھیجے ہوئے رسول ہیں''۔تو یہ ناگزیر ہوگیا کہ انسان غور وفکر سے کام لے۔کیا نبوت کا دعویٰ کرنے والے اس شخص کو حقیقت میں خدا نے بھیجا ہے؟ ان ساری باتوں کو سوچنے پر انسان مجبور ہوتا ہے۔ایک ٹمل شاعر کہتا ہے: ؎

''علم وعرفاں ہی خدا ہے
خدا ہی علم وعرفاں ہے''

حقیقی علم وعرفان یقیناً انسان کو خدا سے آشنا کراتا ہے۔خدا سے بیگانہ لوگ علم وعرفان سے بالکل محروم ہوتے ہیں۔خواہ انہیں اپنے علم کا کتنا ہی زعم کیوں نہ ہو۔

اسلام کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس کو جس نے بھی اپنایا وہ ذات پات کے بھید بھاؤ کو بھول گیا۔

مدگتور (۱) میں ایک دوسرے کا سر قلم کرنے والے جب اسلام کو قبول کرنے لگے تو اسلام نے ان کو بھائی بھائی بنا دیا۔ سارے بھید بھاؤ ختم ہوگئے۔ نیچی ذات کے لوگ نیچے نہیں رہے بلکہ سب مکرم وباعزت ہوگئے۔سب مساویانہ حقوق کے مالک ہوکر اخوت کے بندھن میں بندھ گئے۔

اسلام کی اس خوبی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ برناڈ شا نے جو کسی مسئلہ کے سارے ہی پہلوؤں کا گہرائی سے تجزیہ کرنے والی شخصیت تھی، اسلام کے اصولوں کا تجزیہ کرنے کے بعد کہا تھا:

''دنیا میں باقی اور قائم رہنے والا کوئی دین ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔''

نبی کریمؐ کو ہم کیوں ایک عظیم انسان مانتے ہیں اور ان کی تعریف وتوصیف کیوں کرتے ہیں؟

آج ۱۹۵۷ء میں ہم انسانی شعور کو بیدار کرنے اور عوام الناس کو ان کی خودی سے آگاہ کرنے کی تھوڑی بہت کوشش کرتے ہیں تو کتنی مخالفت ہوتی ہے۔چودہ سو سال قبل جب نبی کریمؐ نے دعوت دی کہ بتوں کو خدا نہ بناؤ۔کئی خدا کو پوجنے والوں کے درمیان کھڑے ہوکر یہ اعلان کیا کہ بت تمہارے خدا نہیں، ان کے آگے سر مت جھکاؤ،صرف ایک

(۱) یہ ٹمل ناڈ گاؤں ہے جہاں اونچی ذات اور نیچی ذات والوں کے درمیان بھیانک فسادات ہوئے تھے۔

خالق ہی کی عبادت کرو۔

اس اعلان کے لیے کتنی جرأت درکار تھی، اس دعوت کی کتنی مخالفت ہوئی ہوگی۔ مخالفت کے طوفان کے درمیان پوری استقامت کے ساتھ آپؐ یہ انقلابی پیغام دیتے رہے، یہ آپؐ کی عظمت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

یہ استقامت جو نبی کریمؐ میں تھی اس کی پیروی آج بھی اہلِ اسلام کرتے ہیں۔

اسلامی نظامِ حیات انسانوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے، انسانوں کے شعور کو جگاتا ہے۔ انسانوں میں اخوت ومحبت کے رشتے پیدا کرتا ہے، انسانی ذہن میں بیداری کو جنم دیتا ہے۔

جبکہ عام مذاہب انسانوں میں تعصب کے جذبات ابھارتے ہیں۔ ایک دوسرے سے لڑاتے ہیں۔ یہاں تک کہ پولس کو دخل دینا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس یہ نظریۂ حیات اور یہ نظامِ زندگی محبت اور پیار کی بنیاد پر انسان کو متحد کردیتا ہے۔

دین اور صحیح نظامِ حیات میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔ اختلاف اس وقت ہوتا ہے جبکہ دین کا تصور ناقص اور محدود ہو۔ یہاں تک کہ یہ تصور قائم کرلیا جائے کہ دین کو زندگی کے عام مسائل سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا۔

دینِ صحیح کو جو بذاتِ خود ایک نظام حیات بھی ہوتا ہے، اگر عملاً اپنایا جائے تو اس سے انسانوں کو فائدہ ہی پہنچے گا، نقصان نہیں۔ اس کے لئے ایک ایسا ماحول پیدا کرنا ہوگا جہاں یہ نظامِ حیات صحت مندانہ طور سے اپنا عمل جاری رکھ سکے۔ اور جہاں انسان کو عدل وانصاف، عزت وبلندی، امن وعافیت اور وہ سب کچھ دلا سکے جس کا وہ ضرورت مند ہے۔

ماحول انسان بناتا ہے۔ جیسا ماحول ہوتا ہے بالعموم لوگ اس کے مطابق اپنے کو ڈھال لیتے ہیں۔ عوام کو یہ فکر نہیں ہوتی کہ ماحول کسی نظامِ حیات کے صحت مندانہ عمل کے لیے موقع دیتا ہے یا نہیں۔ وہ بھیڑ کی طرح آنکھیں بند کرکے چلتے ہیں۔

بڑے لوگ وہ ہوتے ہیں جو اس کی تشخیص کرتے ہیں کہ ماحول کی سمت ٹھیک ہے یا نہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ماحول کا رخ غلط ہے تو وہ اس کے مخالف سمت میں چلنے لگتے ہیں۔ انہیں اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اس مخالف سمت اختیار کرنے سے انہیں سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ حق اور صحیح نظامِ حیات کے صحت مندانہ عمل کی خاطر وہ مخالف سمت میں چلنے کا عزم کرتے ہیں اور اس سمت میں چل پڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ غلط ماحول کو صحت مند ماحول میں بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ تکلیفیں جھیلنے اور مصائب کا شکار ہونے کے باوجود جو راہِ حق پر چلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں حقیقت میں وہی مردانِ کار ہیں۔ ایسے ہی باحوصلہ لوگ وقت سے نبرد آزما ہوکر ایک ایسے ماحول کی تعمیر کرتے ہیں جس میں صحیح نظامِ حیات کارفرما ہوسکے۔

حضرت محمد ﷺ کا شمار ایسی ہی عظیم اور باحوصلہ شخصیتوں میں ہوتا ہے بلکہ آپؐ کی عظمت عام بڑی شخصیتوں سے بھی کہیں بڑھ کر ظاہر ہوئی ہے۔ ایسے عظیم بزرگ شخص کی تعلیمات کو ملک میں عام کرنا چاہیے۔ ان تعلیمات کو عام کرنے کے لیے اچھا ماحول چاہیے جس کے لیے صالح نظامِ تعلیم کا لانا ناگزیر ہے۔ صالح نظامِ تعلیم کے لیے ایک صالح نظامِ حکومت درکار ہے۔ صالح حکمرانوں کے بغیر کسی صالح نظامِ حکومت کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ یہ صالح حکمراں صالح افراد ہی سے مل سکتے ہیں اس سے صالح افراد کی اہمیت اور ان کی قدر وقیمت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ایسے افراد ہی دراصل

کسی سوسائٹی کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں جن پر سوسائٹی کے مستقبل کا سارا انحصار ہوتا ہے۔ان کا ضیاع انسانیت کا سب سے بڑا نقصان ہے۔

دین اسلام ہیرے کی طرح ہے۔ہیرے کا استعمال مختلف لوگ مختلف طریقے سے کرتے ہیں۔کوئی انگوٹھی میں جڑ لیتا ہے، کوئی زیورات میں جڑ لیتا ہے،کوئی اس کو فروخت کرکے حاصل شدہ دولت کو عیاشی میں اڑا دیتا ہے۔

ہیرے کی اہمیت و افادیت یا اس کے ضیاع کا تعلق درحقیقت اس سے ہے کہ انسان اسے کس طرح استعمال کرتا ہے۔ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہیرے سے کہیں بڑھ کر قدر و قیمت کے حامل نظامِ حیات کے ساتھ ہمارا رویہ کیا ہے۔

کیا یہ دین ظالموں کا یا جابروں کا ساتھ دے گا؟ کیا یہ مجبوروں کا حق مارے گا؟ یا اس کے برعکس یہ مظلوم اور کچلے ہوئے لوگوں کی مدد کرے گا؟

عمل کی دنیا میں اگر اول الذکر نتائج ہی سامنے آرہے ہوں تو خواہ ہم اسلام کی کتنی ہی تعریف وتوصیف کرتے رہیں اس کا کوئی وزن نہیں۔ ہاں اگر نتائج مؤخر الذکر شکل میں دکھائی دے رہے ہوں تو یقیناً لوگ یہ باور کر سکتے ہیں کہ یہ نظام دنیا کے لیے سراپا رحمت ہوگا۔

اسلام اپنی ساری خوبیوں اور آب و تاب کے ساتھ ہیرے کی طرح آج بھی موجود ہے۔اب داعیانِ اسلام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دین اسلام کو مخلصانہ طور پر اپنائیں۔اس طرح وہ اپنے رب کی خوشنودی اور رضا بھی حاصل کرسکتے ہیں اور غریبوں اور مجبوروں کے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں۔ اور انسانیت مادی و روحانی ترقی کی طرف تیز رفتاری سے آگے بڑھ سکتی ہے۔ ☆☆☆

خواص سے خطاب

اے طبقۂ خواص! آپ ہی ملت کی آبرو ہیں،خطروں میں گھری اور اندیشوں سے گھبرائی اس ملت کو اللہ کے بعد آپ ہی کا سہارا ہے۔ان سطروں کا لکھنے والا اس وقت شدید کرب والم سے دوچار ہے۔ان چیزوں کے بارے میں سوچتے وقت شرم وافسوس کے غم انگیز احساسات سے اس کی پیشانی عرق آلود ہے،مگر ''نہ جائے رفتن اور نہ پائے ماندن'' کا معاملہ ہے۔خموشی کی تاب ہے اور نہ کہتے بنے ہے۔یہ اخلاقی زوال ہمارے جسمِ ملی کا زخم ہے۔......اور اپنے زخموں کو کریدنا آسان نہیں ہوتا۔مگر......مگر زخم کو صاف کیے بغیر جب تک آپ اوپر اوپر کی مرہم پٹی کیے جائیں گے اندر کی عفونت اور سڑاند بڑھتی ہی رہے گی۔

عیدالاضحیٰ

قربانی کی حقیقت اور مسائل

کلیم اللہ عمری مدنی، جامعہ دارالسلام عمرآباد

قربانی کا مفہوم: قربانی سے مراد اونٹ، گائے، بکرا اور بھیڑ وغیرہ کو عیدالاضحیٰ میں اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ذبح کرنا ہے اور یہ قربانی شعائرِ اسلام میں سے ہے جس کی تعظیم تقوی کی علامت ہے: ذٰلِکَ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ .(الحج: ۳۲) ترجمہ ''بات یہی ہے اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقوی کی بات ہے''۔ آیت کریمہ میں شعائر سے مراد قربانی کے جانور ہیں ان کی تعظیم کا مطلب یہ ہے کہ ان کی صحیح دیکھ بھال کرنا اور موٹا تازہ کرکے قربانی کرنا وغیرہ۔

قربانی کی تاریخ۔ قربانی کی تاریخ اتنی ہی قدیم اور پرانی ہے جتنی قدیم کہ خود انسانی تاریخ ہے، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام ہی کے دور میں ہمیں قربانی کا ثبوت ملتا ہے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں قربانی کی قبولیت کا یہ دستور تھا کہ نذر و نیاز اور قربانی کو کسی بلند مقام پہ رکھ دیا جاتا اور آسمان سے آگ نمودار ہوتی جو اسے جلا دیتی۔ خود قرآنِ مجید نے اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کیا ہے اور ہابیل و قابیل کے جھگڑے کی بنیاد ہی یہی بتاتا ہے کہ دونوں نے قربانی پیش کی ایک کی قبول کرلی گئی آگ نے اسے جلا دیا جبکہ دوسرے کی قربانی رد کردی گئی آگ نے اسے جلایا نہیں: ''وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ...'' (المائدة: ۲۷) ترجمہ'' حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں کا کھلا کھلا حال بھی انہیں سنا دیں کہ ان دونوں نے ایک نذرانہ پیش کیا ان میں سے ایک کی نذر تو قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔

قربانی کی فضیلت: نبی کریم ﷺ کو خصوصیت کے ساتھ قربانی کی عبادت کا حکم دیا گیا اور فرمایا گیا: ''فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ'' اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر۔ حدیث شریف میں آپ ﷺ فرماتے ہیں: قربانی کے دن اللہ کے پاس خون بہانے سے زیادہ کوئی عمل محبوب نہیں ہے۔ قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنی سینگوں، بالوں اور کھروں سمیت آئے گا۔ یقیناً اس کا خون زمین پر گرنے سے قبل اللہ کے پاس قبولیت کا درجہ پالیتا ہے۔ لہٰذا تم قربانی خوش دلی سے کرو۔ (ترمذی، حسن غریب، ۱۴۹۳)

قربانی کی حکمت اور مقصد

قربانی ایک عبادت ہے اور اس بات کا خاموش اقرار ہے

کہ بندہ اللہ کی خاطر وقت پڑنے پر اپنی ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ صرف گوشت اور خون کی قربانی نہیں بلکہ دل کے جذبات اور خواہشات کی قربانی ہے اسی لیے فرمایا گیا: "لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلاَ دِمَائُهَا وَلٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوىٰ مِنْكُمْ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوْا اللّٰهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ." (سورۃ الحج، ۳۷)

ترجمہ، اللہ کو قربانیوں کے گوشت نہیں پہنچتے نہ ان کے خون بلکہ اسے تو تمہارے دل کی پرہیز گاری پہنچتی ہے۔ اسی طرح اللہ نے ان جانوروں کو تمہارے تابع کر دیا ہے کہ تم اس کی رہنمائی کے سلسلے میں بڑائیاں بیان کرو اور نیک لوگوں کو خوشخبری سنا دیجئے۔

قربانی کے جانور میں مطلوبہ اوصاف

اونٹ، گائے، بکری اور بھیڑ (خواہ نر ہو یا مادہ) ان جانوروں کی قربانی دینی چاہئیے بشرط یہ کہ یہ سب جانور عیب دار نہ ہوں۔ احادیث میں چار قسم کے جانوروں کی قربانی سے منع کیا گیا ہے (۱) لنگڑا جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو۔ (۲) کانا و بھینگا جس کا کانا پن واضح ہو۔ (۳) بیمار جس کی بیماری عیاں ہو۔ (۴) کمزور لاغر جانور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو (مغز نہ ہو) (ترمذی، احمد)

نوٹ؛ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ سب سے افضل قربانی اونٹ کی قربانی ہے، پھر گائے کی اور پھر بکری کی، اس لئے کہ خود نبی کریم ﷺ نے بھی اونٹ کی قربانی کی، اس میں فقراء ومساکین کا فائدہ زیادہ ہے (فقہ الحدیث،۲/۱۰۸)

قربانی کا جانور موٹا تازہ ہونا چاہئیے۔ حضرت ابوھریرۃؓ سے مروی ہے کہ جب بھی آپ ﷺ قربانی کا ارادہ کرتے تو دو موٹے تازے سینگ دار، چتکبرے (کالے رنگ کے) خصی کردہ مینڈھے خریدنے کا حکم دیتے۔ (سنن ابن ماجہ)

نوٹ۔ اونٹ پانچ برس کا، گائے وغیرہ دو برس کی، اور بھیڑ بکری ایک برس کی ہونا ضروری ہے، (تلخیص فتاوی رحیمیہ،۳۲۲)

قربانی کے احکام

(۱) اخلاص نیت: تمام اعمال میں ضروری ہے ہر وہ کام جو اخلاص کے بغیر ہوگا اللہ کے نزدیک مقبول نہ ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اعمال کی قبولیت کا دارومدار نیت پر ہے۔ (بخاری)

(۲) مسنون دعا کا اہتمام: قربانی کے جانور کو قبلہ رخ کرنے کے بعد قربانی کرنے سے قبل یہ دعا پڑھیں جیسا کہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے دو سفید سینگوں والے دنبے ذبح کئے میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ اپنا پاؤں اس کی گردن پہ رکھے ہوئے تھے اور بسم اللّٰہ اللّٰہ اکبر پڑھ کر اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے تھے (رواہ بخاری، مسلم) یا آپ ﷺ نے بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ وَ مِنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ پڑھی۔ (مسلم، ابوداؤد، ابن خزیمہ)

(۳) قربانی کے جانور کو اچھی طرح ذبح کیا جائے، ارشادِ نبوی ﷺ ہے: اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْاِحْسَانَ فِيْ كُلِّ شَيْئٍ اِذَا قَتَلْتُمْ فَاحْسِنُوْا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوْا الذَّبْحَ...... (مسلم) ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اچھے طریقے سے کرنا ضروری قرار دیا ہے لہذا تم قتل کرو تو اچھے ڈھنگ سے قتل کرو اور جانور کو ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو۔

(۴) چاقو خوب تیز کرنا، اور ذبح کرنے کے سامان کو جانور سے چھپانا، ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چاقو تیز کرنے کا حکم دیا۔ (سنن ابن ماجہ)

ذبح کی شرطیں:

۱۔ چھری پھیرتے وقت بسم اللہ پڑھنا۔

۲۔ ذبح کرنے والا مسلمان ہو۔

۳۔ شرعی طریقہ سے ذبح کرتے وقت جانور کی شہ رگ کاٹ دی جائے، (فقہ الحدیث،۲/۰)

۴۔ نیز ذبح کے وقت جانور کو قبلہ رخ کرنا بھی سنت سے ثابت ہے، (سنن ابوداؤد، ۲۷۹۵)

۵۔ قصاب کی اجرت: حضرت علیؓ کو رسول ﷺ نے آپ کی اونٹنیوں کے پاس کھڑے رہنے کی تاکید فرمائی اور فرمایا ان کے گوشت اور چمڑے مسکینوں میں بانٹ دو اور قصاب کو قربانی کے جانور میں سے بطور اجرت کچھ نہ دو۔ (بخاری و مسلم)

یعنی بطور ہدیہ دینے کی اجازت ہے نہ کہ بطور اجرت۔

۶۔ قربانی کے چمڑے خود استعمال کریں یا صدقہ کر دیں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ لوگوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ لوگ اپنی قربانیوں سے مشکیزے بناتے اور چربی پگھلاتے ہیں تو آپ ﷺ نے ان کو اجازت دی (مسلم)

نوٹ: ان چمڑوں کو یا اسکی قیمت کو غریب رشتے داروں مستحق لوگوں یا رفاہی اداروں اور مدارس عربیہ کو دے دینا بھی جائز ہے۔

۷۔ قربانی کے جانور میں مشارکت: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ سفر میں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، قربانی کا وقت آ گیا تو ہم گائے میں سات آدمی شریک ہوئے۔ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صححه الالبانی في الترمذي 1501)

۸۔ مینڈھا جو چتکبرا، موٹا تازہ اور قیمتی ہو اس کی قربانی آپ ﷺ کو محبوب تھی، جانور کو پہلو کے بل لٹا کر ذبح کرنا چاہئیے، قربانی اپنے ہاتھ سے کرنی چاہئیے خواہ مرد ہو یا عورت، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اپنی بیٹیوں کو خود ذبح کرنے کا حکم دیتے تھے (بخاری) اور ایک موقع پر آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایک عورت نے ہڈی یا پتھر کے ذریعہ ذبح کر دی۔ کیا وہ بکری کھا سکتے ہیں تو آپ ﷺ نے کھانے کی اجازت دی (بخاری) اگر کوئی کسی کو نائب بنا دے ذبح کرنے کے لیے تو یہ بھی جائز ہے۔

۹۔ قربانی کا گوشت تقسیم کیا جائے: ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَكُلُوا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَ (الحج:۳۶) ترجمہ، اسے خود بھی کھاؤ اور مسکین اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں نے تمہیں پہلے تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے سے منع کیا تھا لیکن اب تمھیں اجازت ہے کہ کھاؤ اور جو مناسب سمجھو ذخیرہ کرو۔ دوسری روایت ہے: پس کھاؤ اور ذخیرہ کرو اور صدقہ کرو اور ایک روایت میں ہے پس کھاؤ اور کھلاؤ اور صدقہ کرو۔

(بخاری، مسلم، از احسن البیان:۹۲۴)

اور سلف صالحین کا طریقہ یہ رہا کہ اس گوشت کو تین حصوں میں تقسیم کر لیتے پہلا اپنے لیے دوسرا دوست واحباب اور رشتہ داروں کو بطور ہدیہ بھیجتے اور تیسرا فقراء و مساکین میں تقسیم کرتے تھے۔

۱۰۔ ہدایات: نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب ذی الحجہ شروع

ہو جائے اور تم میں سے کوئی قربانی کا ارادہ کرے تو چاہیے کہ وہ اپنے ناخنوں اور بالوں کو نہ نکالے (مسلم، احمد)

نوٹ: یہ حکم قربانی کرنے والے سر پرست ذمہ دار کے لیے ہے اس کے علاوہ اس کے گھر کے افراد اس حکم میں داخل نہیں ہیں۔

۱۱۔ اونٹ کی قربانی: اونٹ کو کھڑا کر کے نحر کیا جاتا ہے یعنی بایاں ہاتھ یا پاؤں اس کا بندھا ہوتا ہے اور وہ تین پاؤں پر کھڑا رہتا ہے، نحر کرنے کے بعد سارا خون نکل جائے اور بے جان ہو کر زمین پر گر جائے تب اسے ذبح کر کے اس کا گوشت نکالا جائے۔

۱۲۔ قربانی کئے بغیر قربانی کی نیت سے اس کی قیمت تقسیم کر دینا جائز نہیں کیونکہ قربانی واجب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں رسول اللہ ؐ نے فرمایا: قربانی کے روز قربانی پر خرچ کرنا دوسرے تمام کاموں پر خرچ کرنے سے افضل ہے۔ (دار قطنی)

۱۳۔ قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنا جائز ہے، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ہم قربانی کا گوشت منیٰ کے تین دنوں سے زیادہ استعمال نہیں کرتے تھے بعد میں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں رخصت دے دی اور فرمایا: کھاؤ اور جمع کر کے رکھو۔ (بخاری، مسلم)

۱۴۔ قربانی سے قبل اللہ تعالی کا نام لینا ضروری ہے، بسم الله الله اكبر اللهم منك ولك ، يا اللهم تقبل منى كما تقبلت من حبيبك محمد وخليلك ابراهيم عليهما السلام کے ساتھ قربانی کرنا/ جانور ذبح کرنا مسنون ہے،

میت کی طرف سے قربانی -

(۱) میت وارثین کو اپنی طرف سے قربانی کرنے کی وصیت کر جائے تو وارثین وصیت کے مطابق وصیت کو پورا کریں۔ جیسا کہ حدیث علیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے دو مینڈھوں کی قربانی کی اور بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی طرف سے قربانی کرنے کی وصیت کی تھی، لہذا میں اسے انجام دیتا ہوں۔ (ابوداؤد، ترمذی)

(۲) میت کی طرف سے مستقل قربانی دینا: یہ بھی ایک صدقہ جاریہ ہے جس سے میت کو ثواب پہنچایا جاتا ہے۔ (فتاویٰ اللجنۃ الدائمۃ: ۱۱/ ۴۱۷)

نوٹ ؛ میت کی طرف سے قربانی یا کوئی بھی عمل خیر کسی غیر وارث کی طرف سے کیا جائے تاکہ میت کو اس کا اجر و ثواب مل سکے، اس طرح کا نیک عمل یا صدقہ جاریہ جائز ہے جیسا کہ بعض صحابہ کرامؓ نے دوسروں کے لئے حج کیا (لبیک عن شبرمہ) کسی نے کسی کا قرض ادا کیا تو یہ عمل نبی کریم ﷺ کی زندگی میں ہوا آپ ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا، بلکہ اس کی ہمت افزائی فرمائی، لہذا کسی صاحب خیر کی طرف سے کسی کے حق میں بطور ایصال ثواب صدقہ مالیہ کرنا۔ خواہ اس سلسلہ میں کوئی وصیت ہو یا نہ ہو صحیح ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

قربانی میں عقیقہ ...

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں لڑکے کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا بطور عقیقہ ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔ (سنن ابن ماجہ ۳۱۶۲ صحیح، سنن الترمذی ۱۵۴۹)

☆☆☆

بحث وتحقیق

(قسط-۱)

شہریت کا مسئلہ

محمد قمر الزماں ندوی.........................استاذ مدرسہ نور الاسلام کنڈہ، پرتا بگڈھ

تمہید: اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شہریت کا مسئلہ عصر حاضر کی پیداوار ہے۔ عہد رفتہ میں کسی ملک میں بسنے اور رہائش اختیار کرنے کے لئے خواہ عارضی رہائش ہو یا دائمی قانونی طور پر شہریت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، مسلمان بھی غیر مسلم ملک میں آسانی کے ساتھ رہائش اختیار کرکے اپنی تجارت وکاروبار کو ترقی دیتا اور کسی رکاوٹ کے بغیر اس ملک کا شہری بن جاتا، غیر مسلم حضرات بھی مسلم ممالک میں (ارضِ حجاز کو چھوڑ کر) اسی طرح آباد ہو سکتے تھے، البتہ اہل ذمہ جب اسلامی ملک میں وقتی ضرورت یا تجارتی مقاصد کے تحت حکومت کی اجازت سے رہتے اور امان حاصل کرتے تو انہیں ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا، چنانچہ فقہ اسلامی کے ذخیرہ میں اہل ذمہ کے حقوق کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں کافی تفصیلات ملتی ہیں، علامہ ابن قیم الجوزیہؒ کی مستقل ایک کتاب ''أحكام اهل الذمة'' ہے جس میں تفصیل کے ساتھ ذمیوں کے حقوق کو بیان کیا گیا ہے۔

لیکن عصرِ حاضر میں شہریت کا مسئلہ بین الاقوامی مسئلہ بن گیا ہے اور اس مسئلہ نے بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے، خود اقوام متحدہ نے اس مسئلہ میں کئی اہم فیصلے کئے ہیں اور تجاویز پیش کی ہیں۔

ذیل کی تحریر میں شہریت کے مسئلے کے حوالے سے چند فقہی اور شرعی احکام عصر حاضر کی روشنی میں پیش کیے جائیں گے۔ جو دراصل اسلامک فقہ اکیڈمی کی جانب سے آئے ہوئے سوالات کے جوابات ہیں۔

مسئلہ شہریت اور سیرت نبویؐ: ہجرت کے حکم کے بعد مدینہ میں مہاجرین کا سیلاب اُمڈ پڑا تھا اور آخر کار مدینہ میں مقامی باشندوں کے مقابلہ میں مہاجرین کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی۔ (صحیح بخاری) ان نو واردوں کی آبادکاری کے متعلق آپؐ نے شروع دن ہی سے ایک جامع منصوبہ تیار کر لیا تھا، اس منصوبہ کی جزئیات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے رسول اللہ ﷺ نے نو آبادی اور شہری منصوبہ بندی میں عظیم انقلاب برپا کر دیا تھا، نئے بسنے والوں کی اتنی بڑی تعداد کو اتنے محدود وسائل میں رہائش اور کام کی فراہمی کوئی آسان معاملہ نہیں تھا، پھر مختلف نسلوں، طبقوں، علاقوں اور مختلف معاشرتی وتمدنی پس منظر رکھنے والے لوگ مدینہ میں آ آ کر جمع ہو رہے تھے، ان سب کو سماجی لحاظ سے اس طرح جذب کر لینا کہ ان میں غریب الوطنی اور بیگانگی کا احساس ابھرے نہ مدینہ کے ماحول میں کوئی خرابی

پیدا ہوا اور نہ قانون شکنی اور اخلاقی بے راہ روی کے رجحانات جنم لیں...... جیسا کہ عام طور پر ایسے حالات میں ہوتا ہے ......رسولِ کریم ﷺ کا ایسا زندہ جاوید کارنامہ ہے، جو ماہرین عمرانیات کے لئے خاصی توجہ اور مطالعہ کا مستحق ہے، جدید شہروں میں آبادی کے دباؤ سے پیدا ہونے والے پیچیدہ تمدنی، سیاسی اور اخلاقی مسائل سے نمٹنے کے لئے سیرت نبویؐ سے ماہرین آج بھی بلاشبہ بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

دنیا کو سب سے پہلے رسالت مآب ﷺ نے اس راز سے آگاہ کیا کہ محض سنگ وخشت کی عمارات کے درمیان میں کوچہ و بازار بنادینے کا نام شہری منصوبہ بندی نہیں، بلکہ ایسا ہم آہنگ اور صحت مند تمدنی ماحول فراہم کرنا بھی ناگزیر ہے جو جسمانی آسودگی، روحانی بالیدگی، دینی اطمینان اور قلبی سکون عطا کر کے اعلیٰ انسانی اقدار کو جنم دے اور تہذیب انسانی کے نشو ونما کا ذریعہ بنے۔ (مستفاد از ماہنامہ ندائے اعتدال شمارہ فروری/مارچ ۲۰۱۱ء)

ریاست کی نو آبادی اسکیم اور رسول اللہ ﷺ کی حکمتِ عملی: ریاست کی نوآبادی اسکیم کا یہ بھی اہم حصہ تھا کہ اللہ کی راہ میں وطن چھوڑ کر مدینہ آنے والے لٹے پٹے بے سرو سامان اور بے یارو مددگار مہاجروں کے قافلوں کو جائے رہائش سرکاری طور پر فراہم کی جائے، بلکہ ان نو واردوں کو سرکاری مہمان خانہ میں ٹھہرایا جاتا اور ان کے کھانے اور دیگر ضروریات کا انتظام بھی سرکاری طور پر کیا جاتا بعد میں ان لوگوں کو مستقل رہائش کے لئے جگہ یا مکان مہیا کرنا حکومت کی ذمہ داری تھی۔ تاکہ ان کی آمد مدینہ سے معاشرتی وسیاسی ماحول میں اور ان کے مختلف جگہوں پر آباد ہونے سے بدامنی کی صورت نہ پیدا ہو، نہ یہ ذہنی الجھن وتناؤ کے شکار ہوں، نہ دوسرے ان کی وجہ سے پریشانی محسوس کریں۔ آبادکاری کے دوطریقے اختیار کئے گئے، اولاً کسی ذی ثروت انصاری مسلمان کو کہہ دیا جاتا کہ وہ ایک مہاجر کی رہائش کا اپنے ہاں انتظام کرلیں۔ مگر خیال رہے کہ صرف شروع کے ایام میں ایسا کیا گیا جبکہ اسلامی ریاست صحیح طرح صورت پذیر نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی منظم تھی۔

مہاجروں کو ٹھہرانے کے لئے عموماً بڑی بڑے مکانات تعمیر کئے گئے تھے۔ یہ مکانات کئی کمروں پر مشتمل تھے، ایک کمرہ ایک خاندان کو دیا جاتا البتہ ایسے مکانات میں باورچی خانے وغیرہ مشترکہ ہوتے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ نے مدینہ کی کالونی میں سرکاری طور پر علیحدہ رہائش کے لئے جو مکانات بنوائے وہ تین کمروں کے تھے (ادب المفرد امام بخاری)

شہریت کے رہنما اصول سیرتِ نبویؐ میں: عہد نبویؐ کے اواخر میں مدینہ کا شہر مغرب میں بطحا تک، مشرق میں بقیع الغرقد تک، اور شمال مشرق میں بنی ساعدہ کے مکانات تک پھیل چکا تھا، رسول اللہ ﷺ نے اب وہاں مزید مکانات تعمیر کرنے سے روک دیا شہری منصوبہ بندی کے ضمن میں آنحضرت ﷺ کا یہ اقدام زبردست اہمیت کا حامل ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ وہی کرسکتے ہیں جنہیں جدید صنعتی شہروں کے اخلاق باختہ اور انتشار انگیز معاشرہ کا قریبی مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے، آپؐ نے شہر نو (مدینہ) کو ایک خاص حد سے متجاوز نہ ہونے دیا، اور اس شہر کی زیادہ سے زیادہ حد (۵۰۰) پانچ سو ہاتھ مقرر کی اور فرمایا کہ شہر کی آبادی اس حد سے بڑھ جائے تو نیا شہر بسائیں اور آپؐ نے اپنی زندگی میں بھی اس اصول پر عمل

کرتے ہوئے دو اقدام کئے، ایک یہ کہ اضافی آبادی کو یا تو اور زمینوں میں منتقل کرنے کا حکم جاری کیا تا کہ اس طرح ایک طرف زرعی انقلاب برپا کیا جا سکے اور دوسری طرف نئے لوگوں کی رہائش کے لئے گنجائش نکالی جا سکے۔ دوسری طرف یہ کہ قریظہ اور نضیر کی مفتوحہ بستیوں یا جوف مدینہ کے دیگر قریوں میں پھیلا دیا تا کہ ایک جانب معاشرتی ناہمواریاں پیدا ہونے کے امکانات ختم ہو جائیں اور دوسری طرف صحت مند معاشرہ اور تعصّبات سے پاک معاشرہ تخلیق کیا جا سکے۔ اس میں مبالغہ نہیں ہے کہ رسالت مآب ﷺ نے اپنے مقاصد میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ (نسائی کتاب الصلاۃ)

اللہ کے رسولؐ کے اس نظام سے بدامنی و انتشار پر ایسا کنٹرول تھا کہ آج آبادی کی کثرت، شہروں کی وسعت سے پریشان حکومت اور انتظامیہ سے اس کی اہمیت معلوم کیجئے۔ جس پر اللہ کے رسول نے اپنی حکمتِ عملی سے کنٹرول کر کے چودہ سو سال پہلے اس کی مثال پیش کی تھی۔

آج کل مغربی ممالک میں ٹاؤن پلاننگ کے انہیں ذریں اصول پر عمل کر کے معاشرتی ہیجان اور تہذیبی انتشار کی شدت کو کم کرنے میں ایک حد تک، نمایاں کامیابیاں حاصل کی گئیں ہیں۔

شہریت کی تعریف: عام طور پر شہریت کی تعریف اور تشریح اس طرح کی جاتی ہے کہ یہ لفظ موجودہ دور کی اصطلاح ہے اور شہریت (Citizenship) کا ترجمہ ہے اور قومیت (Nationality) اسی کا وسیع تر مفہوم ہے جس کا معنی ہے، کسی بھی ملک میں قانونی طور سے رہنے کا حق پانا، یعنی فرد اور ملک کے درمیان رابطہ و تعلق کا نام شہریت ہے، جس کا تعین ملکی آئین و قانون کرتا ہے اور اس آئین و قانون کے مطابق اس شہری کو حقوق حاصل ہوتے ہیں اور اس پر ملک کے تعلق سے ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ (آکسفورڈ ڈکشنری)

لیکن احقر کی رائے میں شہریت اپنے جدید مفاہیم کے ساتھ معاصر دور کی پیداوار تو ہے لیکن اس کے ابتدائی خدوخال سے اسلام کی تاریخ نا آشنا نہیں ہے بلکہ میثاق مدینہ کی بعض دفعات سے واضح ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جس اجتماعیت کی بنیاد رکھی تھی اس میں مختلف اہل مذاہب شریک تھے، شہر کی حفاظت ان سب کی مشترکہ ذمہ داری تھی، شہر پر حملہ ہو یا اس معاہدہ میں شامل فریقوں میں کسی فریق پر حملہ ہو تو اس کی مدد اور شہر کا مقابلہ تمام فریقوں پر لازم تھا۔ غور کیا جائے تو شہریت کے موجودہ تصور کی بنیاد میں یہ بات شامل ہے۔

شہریت کی قسمیں: بعض اہل علم نے موجودہ شہریت کی دو قسمیں بیان کیں ہیں (۱) پیدائشی شہریت (۲) اکتسابی یا اختیاری شہریت۔

پیدائشی شہریت: پیدائشی شہریت سے مراد کسی ملک میں پیدائش کی بنیاد پر بچہ کو ملنے والی شہریت ہے، اس میں بھی ذرا تفصیل ہے ایک یہ کہ بچہ کی جائے پیدائش کا اعتبار کیا جائے گا، خواہ اس کے والدین کہیں اور کے رہنے والے ہوں جیسا کہ ارجنٹینا میں قانونی طور پر اس کا اعتبار کیا جاتا ہے، اگر ارجنٹینا کے رہنے والے والدین کے بچے کی پیدائش کسی اور ملک میں ہوئی تو وہ بچہ ارجنٹینا کا شہری نہیں سمجھا جائے گا۔ دوسری تفصیل اس میں یہ ہے کہ بچے کی پیدائش خواہ کہیں پر بھی ہو والدین کی شہریت کا اعتبار کیا جائے گا، والدین جس ملک کے باشندے ہیں بچہ کو اسی ملک کا شہری سمجھا جائے گا خواہ اس کی پیدائش کہیں بھی ہو جیسا کہ جرمنی سویڈن اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ کا

قانون ہے۔ لیکن بعض ممالک ایسے ہیں کہ ان کے یہاں دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں یعنی ان کے ملک کے والدین کے بچے کی پیدائش کہیں پر بھی ہو وہ والدین کے ملک کے شہری کہلائیں گے، اور اگر غیر ملکی والدین کے بچے کی پیدائش اس ملک میں ہوئی ہے تو وہ بھی والدین کے ملک کے بجائے اپنے پیدائشی ملک کے شہری کہلائیں گے جیسا کہ امریکہ برطانیہ، فرانس وغیرہ میں یہ قانون ہے۔ (شہریت کا مسئلہ صفحہ ۷)

اکتسابی یا اختیاری شہریت: اکتسابی یا اختیاری شہریت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص پیدائشی طور پر کسی ملک کا شہری ہے لیکن وہ کسی دوسرے ملک کا شہری بننا چاہتا ہے، یعنی اس کے حصول میں سعی وارادہ کا دخل ہو، اس شہریت کے حصول کے متعدد طریقوں کا ذکر فقہاء نے کیا ہے۔

(۱) اس ملک میں شادی کر لی جائے۔

(۲) حکومت سے شہریت کے حصول کی درخواست کی جائے۔

(۳) اس ملک میں زمین خریدی جائے۔

(۴) سرکاری ملازمت اختیار کر لی جائے۔

(۵) لمبے عرصے تک اس ملک میں قیام کرلے۔

(۶) غیر ملکی والدین کے بچوں کو بالغ ہونے کے بعد شہریت کا اختیار حاصل ہونا وغیرہ۔ (شہریت کا مسئلہ صفحہ ۷)

لفظ شہریت اور عربی ڈکشنری: عربی ڈکشنری بلکہ اسلامی شریعت میں شہریت وطنیت کے ہم معنی ہے، لیکن شہریت کی اصطلاح وطنیت سے قریب تو ہے البتہ مفہوم میں بڑا فرق ہے، شہریت جنسیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جبکہ وطنیت کے لفظ میں بہت توسع ہے، وقتی رہائش گاہ کے لئے بھی وطن کا لفظ استعمال ہوسکتا ہے مگر دونوں میں فرق کرنے کے لئے مستقل قیام گاہوں کو وطن اصلی کہا جاتا ہے اور عارضی قیام گاہوں کو وطنِ اقامت کہا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس معنی میں آج شہریت کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے وہ اصطلاح صرف وطنِ اصلی میں پائی جاتی ہے۔

مواطنہ (شہریت) کی تعریف: لغوی اعتبار سے ''مواطنہ'' لفظ ''واطن'' کا مصدر ہے جس کی اصل ''وطن بالمکان یطن وطنا'' ہے یعنی کسی جگہ قیام کرنا، کہا جاتا ہے۔ اتطن البلد یعنی اس شہر کو وطن بنایا اور استوطن البلد یعنی اس شہر کو وطن بنالیا، ووطن الشخص، یعنی وہ شہری جہاں وہ رہتا ہے۔ (المعجم الوسیط، القاموس المحیط، لسان العرب مادہ وطن)

مواطنہ کو واطن سے مانتے ہوئے یہ مفہوم لینا کہ کسی ملک میں وہاں کے باشندوں کے ساتھ رہنا تو اس بارے میں ''المعجم الوسیط'' کی رائے یہ ہے کہ یہ لفظ محدثہ (جدید) ہے (واضح رہے کہ المعجم الوسیط مجمع اللغۃ قاہرہ کی نمائندگی کرتا ہے) کیوں کہ اہل عرب نے اس لفظ کو اس جدید معنی میں استعمال نہیں کیا ہے۔

فقہاء نے وطن الاقامہ کا لفظ بلد السفر کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے، یعنی وہ جگہ جہاں مسافر اتنی مدت ٹھہرے کہ جس مدت میں مسافر سفر کے احکام سے خارج ہوجاتا ہے، یعنی کم سے کم پندرہ دن۔

موجودہ عرف میں وطنی اس کو کہتے ہیں جو وطنیت پر مبنی فکر کو اوڑھ لے، اس کا دفاع کرے اور حقوق وواجبات کے سلسلہ میں جملہ شہریوں کے درمیان اس لفظ کو ذریعہ کے طور پر استعمال کرے، اور مواطن اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس اس ملک کی شہریت (Nationality) ہو۔ بعض شہریوں

کے درمیان اس طرح فرق کرتے ہیں۔

مواطن اصلی: وہ شہری جن کے حقوق زیادہ ہوتے ہیں۔

مواطن متجنس: ان کے حقوق کم ہوتے ہیں، یا ایسے شہری جو دوسری جگہ سے یہاں آکر رہ رہے ہیں۔

لیکن قرآن وحدیث میں اس بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے قومیت اور وطنیت کو محض تعارف کے لئے بنایا ہے نہ کہ اس لیے کہ اس کے ذریعہ اختلاف پیدا ہو اور آپس میں فخر وغرور کا سبب بنے، اسی طرح قدیم عربوں نے بھی لفظ وطن، اس جدید معنی میں استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ انہوں نے وطن کو منزل اور مکان کیلئے استعمال کیا ہے جہاں انسان رہتا ہے ''لسان العرب'' میں ہے۔الوطن هو المنزل الذی یقیم به وهو موطن الانسان ومحله (لسان العرب مادہ وطن)

اسی معنی میں عربوں نے اشعار بھی کہے ہیں، ابن رومی اپنے گھر کے بارے میں کہتا ہے۔

ولی الوطن ألیت أن لا أربیعه
وألا أری غیری له الدهر مالکا
اذا ذکر وأوطانهم ذکر تهم
عهود الصبا فیها فحنوا لذلکا

بہر حال اوپر کی تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ وطن اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان پیدا ہو، بچپن سے جوانی تک وہاں رہا ہو، اور اس جگہ اور وہاں کے لوگوں سے اس کو محبت ہو، نہ یہ کہ معینہ حقوق حاصل ہوں، یا ایسا کوئی معاہدہ ہو جس کا سیاسی معاہدات کی دنیا میں کوئی خاص مفہوم ہو۔

قرآن مجید میں خود لفظ مواطن استعمال ہوا ہے لیکن اس سے مراد جگہیں ہیں جائے پیدائش اس سے مراد نہیں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ولقد نصرکم الله فی مواطن کثیرة" سورۃ توبہ: ۲۵) ہم نے بہت سے مقامات پر تمہاری مدد کی ہے جیسے بدر اور حنین سے پہلے کے غزوات، کہ یہ مسلمانوں کی پیدائش کی جگہ تھی اور نہ ان کے نشوونما کی جگہ۔

پروفیسر ڈاکٹر علی محی الدین قرہ داغی کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلے عرب عالموں میں جس نے لفظ ''الوطنی'' ''الوطنیۃ'' اور الوطن کو اس کے سیاسی معنی میں استعمال کیا ہے وہ ہیں علامہ طہطاوی (۱۸۰۱/۱۸۷۳ء) ان کے بعد بطرس البستانی (۱۸۱۰/۱۸۸۳) کی کتاب میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے اسلام میں شہریت کی حیثیت)

مواطنہ (شہریت) کا تاریخی پس منظر: مواطنہ کا اولین تصور اس حکومت کے ذریعہ آیا جو مخالفین اور دشمنوں اور ان کے چیلنجز کے سامنے اپنی قوت اور وحدت ثابت کرنے کے لئے اپنے پیروکاروں کو ایک جامع نظام پر لانا چاہتی تھی، اسی لئے ان حکومتوں میں اس کی بعض نشانیاں ملتی ہیں جن کی بنیاد قومیت وعصبیت پر ہے جیسے آشور چین، فارس اور روم وغیرہ، لیکن جب ان قوموں نے ایک خاص دین کو اپنا لیا تو اب یہ دین ہی ان کے درمیان رابطہ کا ذریعہ بن گیا۔قدیم تہذیبوں نے اور خاص طور پر اسلامی تہذیب نے بھی ان شہریوں کے حقوق وواجبات کو واضح کیا ہے جو اس ملک یا سلطنت میں رہتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ اسلامی تہذیب نے شہریت کا کچھ الگ مفہوم بھی متعین کیا تھا، جو غیر محدود تھا، متنوع تھا اور جدید مفہوم کے قریب بھی تھا اور دور بھی، یہاں تک کہ یورپی انقلاب کا دور آیا جس نے مواطنہ کو محدود کر دیا اور اس کو

بڑی حد تک قومیت سے جوڑ دیا، اور پھر مسلمانوں میں بھی مواطنہ کا یہی مفہوم دھیرے دھیرے پنپنے لگا بلکہ بعض مسلمانوں نے یورپ سے زیادہ اس مفہوم کو رائج کیا یہاں تک کہ ۱۹۷۹ء میں کامب ڈیفیڈ معاہدہ کے بعد یہ نعرہ بلند ہوا" مصر للمصریین "یعنی مصر مصریوں کے لئے ہے۔

اسی وطنیت اور قومیت کے طوفان بلا خیز کے مقابلہ کے لئے ندوۃ العلماء کے غیور فرزندوں نے مقابلہ کیا اور علم و تحقیق کی روشنی میں ثابت کیا کہ قومیت اور وطنیت کا نعرہ اسلام اور اصول اسلام سے متصادم ہے۔

شہریت عصر حاضر میں: موجودہ سیاسی افکار کے مطابق شہریت سے مراد کسی ایسے معاشرہ میں شامل ہونا ہے جس کا سیاسی، سماجی اور ثقافتی ڈھانچہ ایک ہو، جس کی بنیاد پر حقوق وواجبات مرتب ہوتے ہوں، لہذا شہریت کی موجودہ تعریف متعین حکومت سے ارتباط ہے، لہذا جو ان حقوق سے مستفید نہ ہو وہ وہاں کا شہری نہیں کہلائے گا، چنانچہ شہری اس سماجی معاہدہ میں داخل ہوگا جو شہریوں اور حکومت کے درمیان ربط پیدا کرتا ہے، اسی وجہ سے اکثر دستور شہریوں کے حقوق اور ان کے فرائض مرتب کرتا ہے تفصیلات کی وجہ سے ان فرائض کو ذکر کرنا ممکن نہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے اسلام میں شہریت کی حیثیت)

جنسیت اور شہریت کے درمیان فرق: اس میں کوئی شک نہیں کہ شہریت کی بنیاد جنسیت (نیشنلٹی) پر ہے، جس کے پاس کسی ملک کی جنسیت ہو وہ اصولی طور پر دستور میں دیئے گئے تمام حقوق سے مستفید ہوگا، نیز اس شہری پر کچھ فرائض بھی عائد ہوں گے۔ اس لئے تمام محققین چند ایک کو چھوڑ کر اس پر متفق ہیں کہ شہریت اور جنسیت میں کوئی فرق نہیں ہے گویا دونوں کے معنی اور مفہوم ایک ہیں یا دوسرے لفظوں میں دونوں کا حاصل ایک ہے۔

لیکن بعض اہل تحقیق نے ان دونوں لفظوں کے معنی اور مفہوم میں فرق کیا ہے وہ یہ کہ جنسیت میں شہریت کے علاوہ کچھ دوسرے حقوق بھی شامل ہیں جیسے باہر سے پشت پناہی وغیرہ۔ (دائرہ المعارف برطانیہ)

عالمی شہریت (انٹر نیشنل نیشنلٹی): عصر حاضر میں جب مغربی مفکرین اور محققین نے یہ محسوس کیا کہ شہریت کے موجودہ مفہوم کو مشکلات اور بین الاقوامی چیلنجز کا سامنا ہے، جیسے انسانی حقوق کے میدان میں سماج واقتصاد ٹکنالوجی عمل وغیرہ میں مساوات کا فقدان، چنانچہ مؤثر تہذیب و مذہب پر مبنی قومیں، مختلف ثقافتیں، گلوبلائزیشن کا ظہور اور اقوام متحدہ کی جانب سے انسانی حقوق وغیرہ کی وجہ سے شہریت کے مفہوم میں وسعت دینے اور اسے عالمی بنانے کی ضرورت پڑی تاکہ ایک نئی اصطلاح سامنے آئے اور وہ ہے ''بین الاقوامی شہریت'' لہذا اس کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ اس شہریت کے دستور اور صفات کو اختصار کی وجہ سے حذف کر رہے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے ''اسلام میں شہریت'')

شہریت حاصل کرنے کی بنیاد کیا ہے؟: اسلام میں شہریت حاصل کرنے یا شہریت حاصل ہونے کیلئے کس بات کو بنیاد بنایا جائے اس کا انحصار حکومت کی صواب دید پر ہے اگر حکومت کسی کو ملک میں محض بود و باش اختیار کر لینے پر یا معاشی سرگرمیاں انجام دینے پر یا ایک مخصوص

مدت تک وہاں قیام پر شہریت دے دیتی ہے تو یہ اس کے دائرۂ اختیار میں ہے، کیوں کہ عصرِ حاضر میں مستقل شہریت کے رائج طریق کار کے مطابق صرف حکومت ان معاملات میں مجاز (Compitent Authority) ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں احقر کی رائے یہ ہے کہ حکومت اور اربابِ حکومت کو میثاق مدینہ، مہاجرین حبشہ کا حبشہ میں عارضی قیام اور نجاشی اور حکومتِ نجاشی اور وہاں کی عوام کا ان کے ساتھ سلوک نیز مدینہ کے اندر مہاجرین کی شہریت اور آنحضرت ﷺ کی شہریت کے سلسلے میں رہنما اصول سے بھر پور فائدہ اٹھانا چاہیے اور خاص طور پر مسلم ممالک کو دل و نگاہ کی تنگی کو ختم کر کے شہریت کے اصول و ضابطہ میں نرمی پیدا کرنا چاہیے اور پوری دنیا کے حکمراں کو یہ باور کرانا چاہئے کہ شہریت کے مسئلہ کا حل اگر کسی کے پاس ہے تو صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے اور اس کے اصول اور ضابطے صرف تعلیمات نبویؐ میں موجود ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ اسلام شہریت کے مسئلے میں فراخ دلی اور کشادہ قلبی کی تعلیمات دیتا ہے، میثاق مدینہ کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غیر مسلم افراد کے لئے شہریت کی بنیاد اسلامی سلطنت میں ''ولاء'' اور تبعیت کے معاہدہ کے تحت موجود تھی، شہریت کی یہ اساس عقیدہ کی اساس کے علاوہ تھی جو اختلاف عقیدہ کے با وجود انہیں اسلامی ریاست کا فرد شمار کرتی تھی، اس اساس پر ملنے والی شہریت کے حقوق وفرائض کے تعین کے لئے نبی کریم ﷺ کا یہ مقولہ فقہی قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے لهم ما للمسلمين وعليهم ما عليهم (ابن حبان)

یہ حدیث میثاق مدینہ کے پچیسویں دفعات کے ابتدائی فقروں کی ترجمانی کرتی ہے جس کے تحت یہود اور مسلمانوں کو معاہدہ ولاء کے تحت یکساں حیثیت کی شہریت حاصل تھی، شہریت کے ضمن میں میثاق مدینہ کی یہ دفعہ دو اہم نکات کی نشاندہی کرتی ہے۔

(۱) مدنی ریاست کا دستور: عقیدہ کی آزادی کے اصول پر قائم ہوا تھا۔

(۲) اس ریاست کا دستور: دیگر سماوی ادیان کے ساتھ برداشت، رواداری کے اصولوں پر مبنی تھا۔

مذہب اسلام نے عقدِ ذمہ سے بھی غیر مسلموں کو شہریت کے حقوق عطا کئے ہیں میثاق مدینہ کی شق نمبر ۱۵ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے، دفعہ کے الفاظ ہیں

اور اللہ کا ذمہ ایک ہی ہے (ان مسلمانوں) کا ادنیٰ فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا۔

اوپر کی تفصیلات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے شہریت کے مسئلہ کو کتنے بہتر انداز میں حل فرمایا تھا کہ مسلم تو مسلم غیر مسلم کے لئے بھی شہریت حاصل کرنا کتنا آسان تھا اور آپؐ نے اس مسئلے کو کس قدر خوش اسلوبی سے حل فرمایا تھا، آج ضرورت ہے کہ مسلم حکمراں خاص طور پر اور پوری دنیا کے سربراہانِ مملکت عام طور پر میثاق مدینہ اور مدنی شہریت نیز ارضِ حبشہ میں مسلمانوں کی بحیثیت مہاجر اقامت اور نجاشی بادشاہ کی فراخ دلی کا گہرائی سے مطالعہ کریں اور پھر اس کی بنیاد پر شہریت کے مسئلہ کو حل کریں اور اس حدیث کو پیش نظر رکھیں۔ "الخلق عيال الله" پوری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اور اس سلسلہ میں بیجا شدت اور غیر انسانی اصول اور

امتیاز اور غیر مساویانہ سلوک سے حتی الامکان پرہیز کریں (واللہ اعلم بالصواب)

مسلم یا غیر مسلم کی شہریت کی درخواست قبول کرنا کیا حکومت پر ضروری ہے؟: اس مسئلہ کا حل سوال نمبر ایک کے ایک جواب کی روشنی میں ہم تلاش کر سکتے ہیں کہ کسی مسلم یا غیر مسلم کی شہریت کی درخواست کو قبول کرنا وہاں کی حکومت کے اختیار میں ہے، اگر اس ملک میں گنجائش ہے اور وہاں مال وزر اور اسباب و وسائل کا افراط ہے، اور درخواست دہندہ کے وہاں قیام سے ملک وملت کا کوئی دینی معاشی اور سماجی نقصان بھی نہیں ہے بلکہ یہ شخص اس ملک کا شہری بن کر ملک کا نام روشن کر سکتا ہے یا وہاں کی حکومت کے لئے مفید بن سکتا ہے، اور وہ شخص اپنے ملک میں معاشی پریشانی سے دوچار ہے اور خطرہ ہے کہ کہیں "كاد الفقر أن يكون كفرا" کی حدیث کا مصداق نہ بن جائے تو ایسی صورت میں اس ملک کی اور حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ اس کی درخواست کو ضرور بالضرور قبول کرلے اور اس کو کفر کی دہلیز پر جانے سے بچائے، جبکہ عام حالت میں جبکہ مسلمان صرف اور صرف معاشی فائدے کی غرض سے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کی غرض سے درخواست پیش کرتا ہے تو حکومت پر ضروری نہیں ہے کہ وہ اس کی درخواست کو ضرور قبول ہی کرلے بلکہ وہ اپنے ملک اور وہاں کے باشندوں کے مفاد کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنے اور قبول کرنے کی مجاز ہوگی۔ ایسے موقع پر حکومت کو حتی الامکان وسعت سے کام لینا چاہیے اور وسعت ظرفی کا ثبوت دینا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسلمان تارکین وطن مسلمان ملک میں کس درجہ کے شہری ہوں گے؟: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمان ملک کے لئے شانِ زیبا تو یہی ہے کہ وہ ان تارکین وطن کو اپنے ملک میں قدیم باشندوں کی طرح ایک شہری ہونے کی سہولتیں فراہم کرے جس طرح کہ انصار مدینہ نے مہاجرین مکہ کو شہر مدینہ میں بسایا اور ان کو ہر طرح کی سہولیات فراہم کیں، لیکن یہ بات یاد رہے کہ مذکورہ حکم اس وقت ہوگا جب کہ اس ملک میں تارکین وطن کے دائمی قیام کے لئے گنجائش ہو، اور ان تارکین وطن کے مستقل قیام سے وہاں کی حکومت اور عوام کو دینی سماجی اور معاشی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، لیکن اگر اس ملک میں ان تارکین وطن کو مستقل قیام کی اجازت سے حکومت اور عوام کو پریشانی کا زبردست سامنا کرنا پڑ سکتا ہو تو اس ملک اور حکومت کو اس کی اجازت ہوگی کہ انہیں پناہ گزیں کا درجہ دے اور ملک کے قدیم باشندوں کی طرح انہیں ایک شہری ہونے کی سہولیتں نہ فراہم کرے، بلکہ حکومت کو اس کا اختیار ہوگا کہ جس ملک سے وہ آئے ہیں وہاں حالات درست ہو جائیں اور مظالم کا سلسلہ بند ہو جائے تو ان پناہ گزیں کو اپنے ملک واپس بھیج دیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نوٹ: حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ مسلمان جب تک اس ملک میں رہیں ان کے ساتھ حسن سلوک کریں اور ان کو مہمان کا درجہ دے کر ان کی خوب خاطر مدارات کریں۔ ان کی ضروریات کی مکمل کفالت کردے۔ (......جاری)

☆☆☆

بحث وتحقیق

فتنۂ وضع حدیث کے اسباب

تلخیص وترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی

منکرین حدیث اپنے نظریہ کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ بالکل ابتدائی دور میں ہی ذخیرۂ احادیث میں موضوع احادیث اس طرح خلط ملط ہوگئی تھیں کہ ان کو الگ کرنا ناممکن تھا جس کی وجہ سے اب وہ حدیثیں قابل احتجاج نہ رہیں تھیں، مگر شاید وہ جانتے نہیں یا جانتے بوجھتے ان جان بنتے ہیں کہ محدثین اور ماہرین اسماء رجال نے کس طرح کدوکاوش کرکے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیا، جس کی وجہ سے نہ صرف ضعیف اور صحیح (یا موضوع اور صحیح) حدیثوں کے درمیان تمیز کرنا ممکن ہوگیا بلکہ بعد کے ادوار میں محدثین نے یہ خدمت وسیع پیانے پر انجام بھی دی، اور موضوعات کے نام سے باقاعدہ ایک سلسلہ شروع کیا جس کے تحت پچاسوں کتابیں لکھی گئیں اور موضوع احادیث کی نشاندہی کردی گئی۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ وضع حدیث کا فتنہ بڑے شدومد سے اٹھایا گیا تھا، یہ بڑا ہی سنگین اور خطرناک فتنہ تھا، اس کے پس پردہ جہاں اور بہت سے مقاصد تھے ایک اہم اور بنیادی مقصد یہ بھی تھا کہ اس طرح ذخیرۂ احادیث کو غبارآلود کردیا جائے تاکہ صحیح اور غلط حدیثوں میں تمیز دشوار ہوجائے، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ پایۂ اعتبار سے گرجاتیں، اور اگر ایسا ہوجاتا تو نہ جانے کرنے والے کیا کچھ کرتے اور اسلام کا کیا حلیہ بناتے، اور اس میں بھی کچھ شبہ نہیں کہ وضع حدیث دراصل مقدمہ تھا انکار حدیث کا، یا (دوسرے لفظوں میں یہ کہ) انکار حدیث کی راہ ہموار کرنے کے لئے ہی وضع حدیث کا سہارا لیا گیا تھا، اس طرح وضع حدیث اور انکار حدیث دونوں فتنوں میں بڑا گہرا رشتہ ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ انکار حدیث کا جنم ہی وضع حدیث کے بطن سے ہوا ہے۔

اس فتنۂ وضع کے مقابلہ کے لئے محدثین نے کس طرح قربانیاں دیں یہ تو اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے، فی الحال وضع حدیث کے اسباب پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں، اس کے لئے ہم نے ڈاکٹر ضیاء عمری کی کتاب ''بحوث فی تاریخ السنۃ المشرفۃ'' سے ایک مضمون کی تلخیص وترجمانی کی ہے۔ (م۔ف۔ح)

حدیث کی حیثیت شریعت اسلامی کے مصدر وسرچشمہ کی ہے، اسی وجہ سے صحابہ سے لے کر ہر زمانہ کے علماء نے اس کی حفاظت پر بھرپور توجہ دی ہے، تاکہ نبی کریم ﷺ کی اقتداء ان کے لئے آسان رہے، کیوں کہ آپ ﷺ کے معمولات وارشادات، اخلاق وعادات اور سیرت وکردار کا تفصیلی علم اسی ذخیرہ سے حاصل ہوتا ہے، اگر یہ باقی نہ رہے یا ناقابل اعتبار ہوجائے تو اسوۂ حسنہ کی پیروی کیا اس کی بات ہی بے معنی سی رہ جائے گی۔

حفاظت حدیث کے اس طویل سلسلہ اور لمبے عرصے میں سیرت وسنت، اسلامی شریعت اور اسلامی تہذیب وثقافت کے دشمنوں کی طرف سے بار ہا اس پر حملے کئے گئے، اس سے کھلواڑ کرنے اور اس کے اعتبار کو کم کرنے یا ختم کرنے کی کوشش کی گئی، اور اپنے سیاسی، مسلکی اور شخصی غلط مقاصد کے لئے طرح طرح سے اسیت استعمال کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں وضع حدیث کا ایسا فتنہ ابھرا جس نے دین اسلام کے اس بنیادی سرچشمہ کو ہلا کر رکھدیا مگر علماء نے حدیث کی چھان پھٹک، تحقیق وتنقید اور موضوع وصحیح حدیثوں کے درمیان تمیز کرکے اس فتنہ کو اس طرح کچل دیا کہ دوبارہ اس کے سر اٹھانے کے امکانات ہی ختم ہو گئے، اور بڑی حد تک اپنی اس کوشش میں یہ حضرات کامیاب بھی ہوئے۔

وضع حدیث سے جہاں بہت سے منفی نتائج پیدا ہوئے وہیں چند مثبت نتائج بھی سامنے آئے چنانچہ قصر حدیث کی پختہ کاری، فن اسماء الرجال اور فن اصول حدیث کی ایجاد اس فتنہ کی وجہ سے ہوسکی، جس کو مسلمانوں کی علمی خدمات میں شاہکار کی حیثیت حاصل ہے، اگر یہ فتنہ نہ بھڑکا ہوتا تو شاید یہ خدمات اس طرح اور اتنے وسیع پیمانہ پر سامنے نہ آتیں۔

حضور اکرم علیہ السلام کے زمانہ میں وضع حدیث کا فتنہ پیدا نہیں ہوا تھا، صحابہ کرام حدیث کے بارے میں بہت ہی محتاط تھے اور کذب کے شائبہ سے بھی پاک تھے۔ اسی طرح حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی یہ فتنہ سر نہ اٹھا سکا، فتنہ ارتداد اس کی راہ ہموار کرسکتا تھا مگر صدیق اکبر نے سر اٹھانے سے پہلے ہی اسے کچل دیا۔

وضع حدیث میں سیاسی اختلافات کا اثر

فتنۂ قتل عثمانؓ کے نتیجہ میں دلوں میں ایک دوسرے سے بغض ونفرت کے جراثیم پیدا ہونے لگے جس سے ہوسکتا تھا کہ ایک دوسرے کے خلاف کیچڑ اچھالنے اور ایک دوسرے کو بدنام کرنے کے لئے ایسا کیا جاتا، مگر شاید ایسا نہ ہوا، چنانچہ دور عثمانی بھی میں ایسی روایات نہیں ملتیں جن سے وضع حدیث کا ارشارہ ملے، اور اس دور کی جو ایک دو روایتیں موضوع درجہ کی بیان کی جاتی ہیں تو خود وہ روایتیں ہی نا قابل قبول ہیں، چنانچہ ابوثور فہمی نے کے حوالہ سے بسند ابن مسعود حضور پاک علیہ السلام کی یہ روایت جو بیان کی ہے جس میں ذکر ہے کہ حضور نے حضرت عثمان کو گمراہ قرار دیا ہے، محدثین نے بحیثیت روایت اسے قبول ہی نہیں کیا ہے، بہرحال دور عثمانی میں وضع حدیث کے اس فتنہ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

اس دور میں بڑے پیمانہ پر سیاسی اختلافات رونما ہونے شروع ہوئے اور جمل وصفین اور نہروان جیسی جنگیں پیش آئیں جن کے نتیجہ میں شیعہ او رخوارج جیسے سیاسی فرقوں کا وجود ہوا جنہوں نے آگے چل کر اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لئے جھوٹی حدیثوں کا سہارا لیا۔ اور چونکہ قرآن سے کھلواڑ کرنے پر ان لوگوں کو جرأت نہ ہوسکتی تھی کہ سینوں میں محفوظ اور سفینوں میں مکتوب تھا اس لئے انہوں نے حدیث کی راہ سے اپنے مقاصد کی تکمیل کی کوشش کی کہ وہ ابھی تک غیر مدون تھیں، اگر چہ اچھی خاصی تعداد مکتوبہ شکل میں موجود تھی مگر غیر مکتوبہ کی تعداد ان سے کہیں زیادہ تھی، ان فرقوں کے نشو ونما اور ارتقاء کے ساتھ ساتھ موضوع احادیث کی تعداد میں بھی اضافہ

ہوتا رہا، شیعوں نے حضرت علیؓ کی فضیلت اور حضرت معاویہؓ کی تنقیص میں، اسی طرح مخالفین شیعہ نے حضرت صدیق وعمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں۔

یہ احادیث زیادہ تر ان موضوعات سے متعلق ہوتی تھیں جن کا تعلق قرن اول کے واقعات سے تھا، ان میں سب سے اہم مسئلہ خلافت کا تھا اور موضوعات کی بڑی تعداد اسی محور کے اردگرد گھومتی ہے، اسی طرح عباسیوں کے مفاد اور بھلائی کے لئے حدیثیں وضع کی گئیں، اور امویوں کو خلافت سے دور رکھنے کے مقصد سے بھی حدیثیں گھڑی گئیں۔

عراق اور خاص طور سے کوفہ وضع حدیث کا مرکز تھا، پیسوں کے لالچ اور دو ٹکے کے عوض وضع حدیث کا کاروبار خوب رفتار سے چلتا تھا، اسی طرح محبوبیت و مقبولیت کی حرص نے نا اہلوں کو بھی شیخ الحدیث بننے کے خواب دکھادئے تھے جس کی وجہ سے وہ آئے دن مسند درس پر نت نئی احادیث سناتے رہتے تھے۔

کوفہ کی اس روش کی وجہ سے دوسرے شہروں میں وہ اس قدر بدنام ہو چکا تھا کہ امام زہری جیسے محدث کا نظریہ یہ تھا: میں عراقی حدیثوں کے بارے میں بار بار تردد کا شکار ہوتا ہوں'' حتی کہ مسائل و احکام کے بارے میں عراقیوں کے بجائے شامیوں پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ بات یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ کبار محدثین عراقیوں کی روایت کردہ حدیثوں سے اعراض برتنے لگے تھے، چنانچہ عبداللہ بن مبارک اور امام مالک جیسے جلیل القدر محدثین نے ان کی روایات سے بالکلیہ بے اعتنائی برتی۔

کوفہ وعراق کی اس کے روش اور اس کے نتیجہ میں بدنامی کا اصلی سبب یہ تھا کہ سیاسی ہنگامے اور سیاسی طوفان زیادہ تر عراق میں ہی آئے تھے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام علماء نے بالکلیہ عراقی روایات سے صرف نظر کیا اور اگر ایسا ہوتا تو یہ ایک علمی خسارہ ہوتا، چنانچہ جلد ہی کوفہ کی اس روش میں کمی آئی اور محدثین کی نظر عنایت ان پر پڑنے لگی کیوں کہ کوفہ میں صحابہ کی بڑی تعداد (تین سو اصحاب بیعت رضوان اور ستر اصحاب بدر) قیام پذیر ہوگئی تھی، اور آگے چل کر شعبہ وحماد جیسے کبار محدثین وعلماء یہاں پیدا ہوئے جنہوں نے موضوع اور صحیح روایات میں کانٹ چھانٹ کی اور احادیث کی عظیم خدمت انجام دی، بالآخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علماء کا اعتماد عراق پر بحال ہونا شروع ہوا اور پھر امام بخاری جیسے محدث اعظم نے اپنی صحیح میں عراقیین کی ایک بڑی تعداد سے روایات نقل کیں۔ اسی طرح دوسری کتب صحاح میں بھی عراقیوں کی مرویات لی گئیں۔

وضع حدیث میں خوارج کا رول:

تحریک وضع حدیث میں خوارج کا کوئی رول نہیں رہا کیوں کہ ان کے نزدیک مرتکب کبیرہ کافر ہوتا ہے اور جھوٹی حدیث گھڑنا ظاہر ہے کہ گناہ کبیرہ ہے، اور ان کے عقیدہ کی رو سے ایسا کرنے والا کافر اسی وجہ سے انہوں نے حدیث کے تعلق سے جھوٹ نہیں بولا، چنانچہ کتب موضوعات میں ایسے دلائل نہیں ملتے جن سے پتہ چلے کہ خوارج نے احادیث وضع کی ہیں۔

ابن لہیعہ اور اُعمش وغیرہ سے جو دو ایک روایات اس طرح کی ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان حضرات نے دو ایک خارجیوں کو جھوٹی حدیث بیان کرتے دیکھا تھا تو اولاً تو یہ

روایات ہی صحیح نہیں، بالفرض اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ روایات قابل اعتبار ہیں تو یہی کہا جائے گا کہ یہ استثنائی واقعات ہیں، جو محض ایک دو لوگوں کے ذاتی کرتوت ہیں، ورنہ علماء جرح و تعدیل کے بہت سے اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ خوارج روایت حدیث میں سچ سے کام لیتے تھے۔

فتنۂ وضع حدیث کے فروغ میں کلامی اختلافات کا اثر: جس وقت وضع حدیث کی یہ تحریک شروع ہوئی تھی اسی دوران مختلف کلامی فرقے بھی ظہور پذیر ہوئے، قدریہ، مرجیہ، جہمیہ، مشبہہ اور پھر معتزلہ، ان تمام فرقوں نے وضع حدیث کے اس فتنہ کو ہوا دی اور موضوعات کی تعداد میں گوناگوں اضافہ کیا۔

ان فرقوں نے جہاں ایک طرف عقلی اور نظریاتی صلاحتیوں کو ابھارا تو دوسری طرف مسلم معاشرہ کی اجتماعیت کو بھی پارہ پارہ کیا۔

جب ان فرقوں نے سر ابھارا تو انہیں اپنے افکار و عقائد کے اثبات کے لئے شرعی نصوص کے سہارے کی ضرورت پڑی اور جب اس طرح کی نصوص انہیں نہ مل سکیں تو اپنا مدعا ثابت کرنے کے لئے انہوں نے حدیثیں گھڑنا شروع کر دیں۔

ایمان کم زیادہ ہوتا ہے یا نہیں؟ انسان مجبور محض ہے یا مختار؟ قرآن مخلوق ہے یا نہیں؟ ان جیسے دسیوں اختلافات کی وجہ سے دونوں گروپوں کی طرف سے اپنے اپنے قول کی تائید میں بے شمار حدیثیں وضع کی گئیں۔

موضوعات کی اس کثرت اور باہمی تناقض کی وجہ سے بعض متکلمین نے محدثین کی تنقید و تنقیص شروع کر دی، ابن قتیبہ نے اپنی کتاب ''تأویل مختلف الاحادیث'' میں محدثین کے دفاع کا فریضہ انجام دیا اور اختلاف حدیث کے اسباب کا تفصیلی ذکر کیا جس سے ثابت ہوا کہ موضوعات کی کثرت میں محدثین قصور وار نہیں بلکہ یہ کلامی فرقے اصلا مجرم ہیں، یہ تو محدثین کا کرشمہ ہے کہ انہوں نے اس سازش کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

زنادقہ اور وضع حدیث

فتنۂ وضع حدیث کے ابتدائی دور ہی سے زنادقہ نے حدیث کی تنقیص اور اس کی اہمیت گھٹانے کے مقصد سے اس فتنہ کے فروغ میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، یہ لوگ اسلام کی آڑ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے سینے میں دشمنی رکھتے تھے، اور ابن حبان کے بقول: یہ لوگ کافر تھے، خدا اور یوم آخرت پر ان کا ایمان نہیں تھا، شہروں میں جا کر اہل علم کی مشابہت اختیار کرتے اور حدیثیں گھڑتے۔

جیسا کہ آگے چل کر بعض زندیقوں نے خود اس جرم کا اعتراف کیا اور تسلیم کیا کہ انہوں نے حدیثیں وضع کی تھیں، بعض نے چار چار سو حدیثوں کے وضع کرنے کا اقرار کیا، حماد بن زید کے بقول: زنادقہ نے چودہ ہزار حدیثیں وضع کیں۔

زنادقہ کی وضع کردہ حدیثیں کچھ تو اخلاقیات سے متعلق تھیں کچھ عقائد سے اور کچھ فقہ سے۔

قصاص اور وضع حدیث

مسجدوں میں قصہ گوئی کا رواج بالکل ابتدائی دور سے ہی تھا، قصہ گو حضرات واقعات و قصوں میں نمک مرچ لگانے کے لئے خوب الٹی سیدھی اور جھوٹی سچی حدیثیں بیان کرتے، عوام

ان کے اس پھندے میں پھنس جاتی۔

ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ: یہ قصاص لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ان کا دل جیتنے کے لئے منکر وغریب اور جھوٹی حدیثیں سناتے، اور عوام کا حال یہ تھا کہ جہاں انہیں خارق عادت اور تعجب انگیز قصے سننے ملتے وہیں بھیڑ لگا لیتے۔

اسی وجہ سے علماء نے قصاص کے پاس جانے اور بیٹھنے سے منع کیا، جیسا کہ عاصم کہتے ہیں: ہم ابوعبدالرحمٰن سلمی کے پاس آتے جبکہ ہم نوجوان تھے، تو وہ ہم کو قصہ گو لوگوں کے پاس بیٹھنے سے منع کرتے۔

علماء نے بھی ان جھوٹے سچے قصے سنانے والوں کا خوب تعاقب کیا اور بسا اوقات بھری محفل تک میں ان کے جھوٹ کو واضح کر کے انہیں رسوا کیا، ایک موقعہ پر امام اعمشؒ بصرہ کی مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک قصہ گو ان کے واسطہ سے حدیث بیان کر رہا ہے، امام حلقہ کے درمیان پہنچے اور بغل کے بال اکھاڑنے شروع کر دئے، اس قصہ گو نے ٹوکا اور شرم دلائی تو امام صاحب نے کہا کہ شرم تو تجھے آنی چاہیے کہ جو کچھ تو نے کیا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ برا ہے جو میں نے کیا، تو نے میرے حوالہ سے ایسی حدیث بیان کی جو میں نے نہیں سنائی،

لیکن بعض قصاص اتنے ہٹ دھرم ہوتے کہ بجائے اپنا جرم قبول کرنے کے الٹا ٹوکنے والے کا مذاق اڑاتے، چنانچہ ایسے ہی ایک شخص نے امام احمدؒ اور یحیی بن معینؒ کے حوالہ سے ایک طویل حدیث بیان کی۔ جب ان حضرات نے ٹوکا اور اور اپنا تعارف کرایا کہ ہم ہی احمدؒ و یحیی ہیں تو وہ کہنے لگا کہ آج تک میں سنتا آیا تھا کہ یحیی بن معین احمق ہیں، آج خود بھی دیکھ لیا، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ دنیا میں صرف آپ دونوں ہی احمد و یحیی ہیں؟ میں نے ان کے علاوہ ستر احمد نام کے لوگوں سے روایت کی ہے۔

اور جیسا کہ ابن حبان نے لکھا ہے کہ جب امام احمد و یحیی بن معین جیسے حضرات کے سامنے ان کی جرأت کا یہ حال تھا تو پھر عوام کے سامنے یہ کیا کچھ نہ کرتے ہوں گے۔

جاهل صوفیوں کی طرف سے وضع حدیث

ترغیب وترہیب یعنی اچھائیوں پر ابھارنے اور برائیوں سے روکنے کے لئے بہت سے صوفی حضرات نے اپنی جانب سے جھوٹی حدیثیں گھڑنا شروع کیں، یہ محض ان کی جہالت تھی ورنہ اس مقصد کے لئے صحیح احادیث کے ذخیرہ میں وافر مقدار موجود تھی، اس طرح کے زاہد، صوفی اور عابد لوگوں میں غلام خلیل، ابو داؤد نخعی اور وہب بن حفص بہت مشہور ہیں، غلام خلیل کے زہد کا لوگوں پر اتنا اثر تھا کہ اس کی وفات پر بغداد کے بازار تک بند کر دئے گئے، ابو داؤد سجستانی کے بقول اس نے چار سو حدیثیں وضع کیں۔

کرامیہ (ابوعبداللہ محمد بن کرام کے متبعین) نے تو ترغیب و ترہیب کے مقصد سے حدیثیں گھڑنے کو جواز فراہم کر رکھا تھا اور من كذب على متعمداً الخ کی تشریح اس طرح کی تھی کہ ہم جھوٹ آپ ﷺ پر نہیں بولتے بلکہ آپ کے لئے بولتے ہیں۔

قرآن کی سورتوں کے خاص خاص فضائل پر دلالت کرنے والی حدیثیں زیادہ تر موضوع ہیں اور واحدی، ثعلبی اور زمخشری نے بھی ان کو خوب بیان کیا ہے، اسی وجہ سے امام احمد کا مشہور جملہ ہے کہ تین طرح کی کتابوں کی کوئی اصل نہیں، مغازی،

تفسیر اور ملاحم، امام عسقلانی نے اس مجموعہ میں فضائل کی حدیثوں کا اور اضافہ کیا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ سورتوں کی تمام احادیث موضوع ہیں، بلکہ ایک بڑی تعداد صحیح حدیثوں کی بھی ہے اور امام سیوطی نے ان کے بارے میں ''خمائل الزہر فی فضائل السور'' نامی ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے۔

علماء نے اس طرز فکر کی سنگینی کو محسوس کیا اور اس فتنہ کے سد باب کی پوری کوشش کی۔

وضع حدیث کا ایک اہم سبب تعصب پرستی: اپنے امام، جنس وقوم اور اپنے علاقہ ووطن کے لئے تعصب کے جذبات نے بھی وضع حدیث کا خوب کاروبار کیا۔

جب بہت سے علاقے اسلام کے زیرنگیں آئے اور عرب وہاں جا جا کے بسنے لگے اور اس طرح عرب وعجم کا اختلاط ہوا تو اس کے نتیجے میں اپنے اپنے علاقے اور شہر کے بارے میں تعصب کے جذبات پنپنے لگے، اور آگے چل کر انہی جذبات نے شہروں کے فضائل اور مذمت میں احادیث گھڑنے پر اکسایا، کدیمی نے بصرہ کی فضیلت میں ایک حدیث گھڑی، احمد بن کنانہ شامی نے قزوین کی فضیلت میں چالیس حدیثیں وضع کیں۔

اسی طرح عمار بن زربی نے بصرہ کی مذمت میں اور ابان بن ابوعیاش نے خراسان کی مذمت میں حدیثیں وضع کیں۔

اسی طرح جنسی عصبیت کے جذبات نے بھی اس مذموم عمل میں حصہ لیا، چنانچہ یحی بن ابی سلیمان، اسماعیل بن زیاد، اور عنبسہ بصری کے نام اسی زمرہ میں آتے ہیں۔

اسی طرح مسلکی تعصب کی بنیاد پر بہت سی حدیثیں وضع کی گئیں، چنانچہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی اور دوسرے بہت سے فقہی مسلکوں کے اماموں کے فضائل میں حدیثیں گھڑی گئیں۔

کچھ دوسرے خاص مقاصد جن کی وجہ سے حدیثیں گھڑی گئیں: امراء وحکام کو خوش کرنے اور ان سے قریب ہونے کے مقصد سے بھی حدیثیں وضع کی گئیں، جیسے غیاث بن ابراہیم نے مہدی کو خوش کرنے کے لئے کبوتر بازی کی فضیلت میں حدیث گھڑی، قاضی ابوالبختری نے ہارون رشید کو خوش کرنے کیلئے قباء اور نطاق پہننے کی فضیلت میں حدیث وضع کر ڈالی۔

ایک لڑکے کی کسی استاد نے پٹائی کردی تو اس نے معلمین کی مذمت میں ایک حدیث گھڑ دی۔

بعض لوگ جھوٹی حدیثیں سنا کر لوگوں سے کمائی کرتے اور پیسے وصول کرتے، چاول، بیگن، دال وغیرہ کی فضیلت پر دلالت کرنے والی حدیثیں زیادہ تر انہی لوگوں کی وضع کردہ ہیں،

بعض لوگ اپنی مہارت اور علم وتجربہ کا اظہار کرنے کے لئے بھی حدیثیں وضع کرتے۔

(خلاصہ یہ کہ اس فتنۂ وضع کی نشو ونما اور ارتقاء میں ان جیسے بہت سے مذموم مقاصد کارفرما تھے، جنہوں نے حدیث کی شبیہ کو مسخ کرنے کی بہت کوشش کی مگر محدثین کی قربانیوں اور جانفشانیوں کی بدولت ان کی یہ کوششیں کارگر نہ ہوسکیں، اور حدیث کا ذخیرہ گو کہ متاثر ہوا مگر مٹایا نہ جاسکا)

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

معاشرتی اصلاح کے نمایاں عناصر

(سورۂ نور کی روشنی میں)

محمد فرمان ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

قرآنی علوم کی جامعیت :

قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے، وہ بے شمار علوم وفنون کا مجموعہ ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بقول: قرآنی علوم پانچ حصوں میں منقسم ہیں: علم احکام، علم جدل، علم تذکیر بآلاء اللہ، علم تذکیر بالموت، علم تذکیر بأیام اللہ۔ یہ علوم معاشرہ کے تمام پہلوؤں پر محیط ہیں، ہدایت واصلاح قرآن کا اصل موضوع ہے، اس لئے اس میں معاشرہ کے تمام امراض کا حل موجود ہے، واضح رہے کہ آیات احکام کے نزول کا مقصد ہی معاشرے سے ناانصافی اور بےاعتدالی کو دور کرنا ہے۔

معاشرہ کی اصلاح وقت کی ضرورت :

معاشرہ افراد کے مجموعہ کا نام ہے، افراد اگر صالح ہوں تو معاشرہ خود بخود صالح ہوگا، اگر ان میں ایمان اور عمل صالح کی صحیح تخم ریزی ہو جائے تو عہد رسالت کا نمائندہ اور قرن اول کا شاہکار ہوگا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ فرماتے ہیں: ''معاشرہ کا یہ عیب نہیں کہ وہ فاسد الاخلاق ہو گیا ہے، خطرہ کی بات یہ ہے کہ معاشرہ فاسد المزاج ہوگیا ہے، اور کسی معاشرہ کا فاسد الاخلاق ہونا اتنا خطرناک نہیں ہے اس کے لئے سو تدبیریں ہیں، لیکن جب معاشرہ فاسد المزاج ہو جائے تو پھر دوا بھی اثر نہیں کرتی، اس وقت معاشرہ کی خبر لینے کی ضرورت ہے''۔ (دعوت فکر وعمل: ۱۰۱ طبع اول ۱۹۹۹ء)۔

سابقہ قوموں کا مشترکہ مرض :

قرآن نے جامع تعلیمات کا ایک پورا مرقع پیش کیا ہے، اس میں معاشرہ کے تمام امراض کا مناسب علاج موجود ہے، اولوالعزم انبیاء کے واقعات کا تذکرہ بطور خاص کر کے ان کی عملی شکل پیش کی ہے، معاشرہ میں سب سے بڑی برائی عقیدہ کی خرابی اور اس کا بگاڑ ہے، قرآن نے انبیائے کرام کو جو تعلیمات دیں ان میں اصلاح عقائد کو خاص اہمیت دی ہے، سابقہ قوموں میں عقیدہ کے بگاڑ کے ساتھ متنوع امراض پائے جاتے تھے، مثلا قوم عاد میں شرک کے ساتھ تکبر، اور ظلم، قوم ثمود میں شرک کے ساتھ کاریگری پر فخر، قوم لوط میں شرک کے ساتھ لواطت، قوم مدین میں شرک کے ساتھ ناپ تول میں کمی، فرعون میں خدائی کے دعوی کے ساتھ دوسروں کو حقیر سمجھنا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم کے نبی کو توحید کا مبلغ اور داعی بنا کر بھیجا گیا، یہ حقیقت ہے کہ شرک سب سے بڑی ذلت اور توحید سب سے بڑی عزت ہے، سورۂ حج میں آیا ہے کہ ومن

يشرك بالله فكأنما خر من السماء فتخطفه الطير أو تهوي بـه الريح في مكان سحيق۔ (جوشرک کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ وہ آسمان سے زمین پر آ گیا ہو، چاہے اس کو پرندے اچک لیں یا وہ ہوا کے دوش پر دور دراز علاقوں میں جا پڑے)۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی معاشرتی برائیوں کے پیدا ہونے کے اسباب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''معاشرتی برائیاں نام ہے عقل وارادہ کی کمی کا، جب انسان میں عقل وارادہ کمزور پڑ جاتا ہے تو وہ برائی کی طرف مائل ہو جاتا ہے، جس سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے، انسانی افراد و اجتماع کو روحانی اور مادی نقصان پہونچتا ہے، بلکہ یہ برائیاں جب کسی قوم میں عام ہو جاتی ہیں تو قوم وملت کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنتی ہیں''۔(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل : ۳۲۳ دارالرشید لکھنؤ ۲۰۱۲ء)

معاشرتی مسائل پر مبنی سورتیں :

معاشرے کی اصلاح کے لئے پورے قرآن میں جہاں جامع تعلیمات پیش کی گئی ہیں، وہیں بعض سورتوں میں خاص طور سے ان کی نشاندہی کی گئی ہے، مکی سورتوں میں عام طور پر اصلاح عقائد اور اخلاقی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے، ، مدنی سورتوں میں معاملات اور معاشرت کے اصول وضوابط ذکر کئے گئے ہیں، قرآن کی جن سورتوں میں معاشرت کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے ان میں سورۂ نساء، سورۂ احزاب، سورۂ حجرات، سورۂ طلاق اور سورۂ نور ہے۔ یہی وجہ کہ بعض علماء کے نزدیک ان سورتوں کو ہر گھر میں باربار پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے، یہ سورتیں اپنے مضامین کے ساتھ آج بھی ہر کلمہ گو کیلئے اصلاح معاشرہ کے نمایاں اصول فراہم کرتی ہیں۔

سورۂ نور ایک تعارف :

سورۂ نور مدنی سورت ہے، اس میں شرعی احکام کے ساتھ معاشرتی اور عائلی مسائل کو خاص طور سے موضوع بنایا گیا ہے، یہ خانگی زندگی کو بہتر بنانے کے اصول فراہم کرتی ہے، اس میں گھروں میں داخل ہونے کے لئے اجازت لینے، نگاہ جھکانے ، شرم گاہوں کی حفاظت کرنے ، مرد وعورت کے اختلاط سے بچنے کی تفصیلات موجود ہیں ، حاشية العلامة الصاوي (ج ۴/ ۱۷۱) میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے گورنر کو خط لکھا کہ مسلم خواتین کو سورۂ نور کی تعلیم دو۔

سورت کی وجه تسمیه :

تفسیر منیر میں شیخ وھبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''اس سورت میں ایک آیت ہے، جس کا ایک ٹکڑا ہے: اللــه نـور السـماوات والأرض (اللہ زمین وآسمان کا نور ہے) وہی آسمان وزمین میں روشنی پیدا کرنے والا ہے، اس کی روشنی سے یہ جہاں منور ہے۔ اور اس سے گم کردۂ راہ انسانوں کو ہدایت ملتی ہے، اسی آیت سے سورہ کا نام ماخوذ ہے، یہ سورت معاشرتی زندگی کے راستے کو فضائل وآداب، احکام وتعلیمات سے مزین کرتی ہے''۔(التـفسيـر الـمـنير في العقيدة والشريعة والمنهج ج ۱ / ٤٤٨)۔

اصلاحی مشن کے تدریجی مراحل :

ہر انسان چاہے وہ مرد ہو یا عورت، اس کو اللہ تعالی کے مامورات کو ماننے اور منہیات سے دور رہنے کا حکم دیا گیا،

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنه فانتھوہ (رسول جوتم کو دیں اس کو لے لو اور جس سے باز رکھیں اس سے دور رہو)۔ یہ دونوں امر عمل کرنا اور باز رہنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان کے اندر دو جذبات مکمل شکل میں موجود نہ ہوں: (۱) شوق (۲) خوف، اسلام کی تمام عبادات میں یہی امور مضمر ہیں، یا تو انسان جنت، اس کی نعمتوں کے شوق میں عمل کرتا ہے یا جہنم، اس کے عذاب کے ڈر سے گناہوں، جرائم سے باز رہتا ہے، اور یہ دونوں امور اللہ تعالی کی ذات کے ہمہ وقت استحضار سے حاصل ہوتے ہیں، اسی کو حدیث پاک میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے کہ انسان اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، اور اگر یہ کیفیت نہ پیدا ہو تو یہ ہے کہ اللہ تعالی کی اس پر نظر ہے، یہ احسانی کیفیت انسان کو ہر قسم کے جرائم سے باز رکھتی ہے۔

جرائم پر کنٹرول پانے کے تین مرحلے :

قرآن نے اصلاح ودعوت کا یہ اصول مرتب کیا ہے کہ پہلے مرحلہ میں ذہن سازی کی جائے، فضائل اور آداب کے ذریعہ سے طبیعتوں کو تیار کیا جائے، نقصانات اور خسارے کی وضاحت کرکے اس کے منفی اثرات سے بچایا جائے، اسی کو قرآن نے تزکیہ سے تعبیر کیا ہے، تزکیہ کا عمل انبیاء کے مشن کا حصہ اور ان کے دعوتی پروگرام کا جزء لا ینفک ہے۔

دوسرے مرحلے میں ایسے اسباب ووسائل پر پابندی عائد کی ہے جو گناہوں کو فروغ دینے والے ہیں، اور ان کو دیکھ کر جرائم کا گراف بڑھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے ساتھ ان برتنوں کے استعمال پر بھی پابندی عائد کی جن کو دیکھ کو شراب کی یاد تازہ ہوگی، چنانچہ ایسے وسائل حرام کئے گئے، جو شر تک پہونچانے والے ہیں، اسی کو فقہاء نے سدا للذرائع ممانعت سے تعبیر کیا ہے۔

تیسرے مرحلے میں حدود وقصاص کے ذریعہ جرائم کی روک تھام کی ہے، اس طرح کچھ طبیعتیں فضائل کے اثرات سے گناہوں سے باز رہتی ہیں، اور کچھ اسباب ووسائل کے استعمال نہ کرنے سے گناہوں سے دور رہتی ہیں اور کچھ سختیوں اور سزاؤں کے ڈر سے اپنے کو حرام کردہ چیزوں سے دور رکھتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ جب دنیا میں تشریف لائے تو آپ نے معاشرہ کو برائیوں سے پاک کرنے کے لئے کئی اقدامات کئے ''رسول اللہ ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور آپ نے جرم وگناہ کے اس جنگل کو صدق وصفا اور محبت ووفا کی بستی بنا دیا، آپ ﷺ نے اس کے لئے تین طریقے استعمال کئے، اول دلوں کا تزکیہ اور لوگوں کی فکر اور سوچ میں انقلاب، دوسرے ان اسباب ومحرکات کا سد باب جو جرم میں معاون ہوتے ہیں، تیسرے سنگین جرائم پر سخت سزائیں، یہی طریق کار تھا، جس نے جرائم کے خوگر عرب سماج کی حالت بدلی اور انسانیت کے قاتلوں کو انسانیت کا محافظ اور نگہبان بنا کر کھڑا کردیا'' (راہ عمل: جرائم، مرض اور علاج ۴۳۵، ہدی بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد۲۰۱۲ء)

مرحلہ وار تربیت کا ایک قرآنی نمونہ اور سورۂ نور سے اس کی تطبیق : قرآن کا اسلوب انذار وتبشیر تدریجی ہے، اس نے مرحلہ وار اوامر ونواہی

کے ذریعہ معاشرہ کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے، اس کی بہترین مثال شراب کی حرمت کے احکامات ہیں، اللہ تعالی نے یک بارگی شراب کو حرام نہیں کیا، بلکہ اس میں تدریجی مراحل کو پیش نظر رکھا، پہلے یسألونك عن الخمر والميسر، قل فيهما اثم كبير ومنافع للناس، واثمهما اكبر من نفعهما، (وہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے ان میں گناہ زیادہ ہے، اور منفعتیں بھی ہیں لیکن گناہ کا پہلو نفع سے زیادہ ہے) (بقرہ)، پھر يأيها الذين آمنوا لا تقربوا الصلاة وأنتم سكارى حتى تعلموا ماتقولون (نساء) (اے ایمان والو! حالت نشہ میں نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ تم کو ہوش آجائے، اور جو تم کہہ رہے اس کا علم بھی تم کو ہو،) اس کے بعد: يأيها الذين آمنوا انما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه، لعلكم تفلحون (مائدة) (اے ایمان والو شراب، جوا، بت اور فال کے تیر گناہ کے عمل ہیں، اس سے بچو، تاکہ تم فلاح پاسکو) اس طریقہ انذار سے مدینہ کی گلیوں میں شراب ایسی پھینکی گئی کہ نالیاں بہہ پڑیں، اور سب نے یک زبان ہوکر کہا: انتهينا ربنا، انتهينا، اے ہمارے رب! ہم باز آگئے، ہم باز آگئے۔

سورۂ نور کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالی نے اس میں جہاں ایک طرف فضائل وآداب کو واضح کیا ہے، اور اسباب ووسائل کے اختیار کرنے سے روکا ہے وہیں اسلامی سزاؤں کے ذریعہ معاشرے کو ناپاک عناصر سے پاک کرنے کی طرف توجہ کی ہے۔ اور ہر چیز کو مرحلہ وار پیش کرکے لوگوں کے لئے عمل کو آسان بنادیا ہے۔

سورت کے موضوعات اور اصلاح معاشرہ کے نمایاں عناصر:

۱۔ زنا کی سزا

۲۔ الزام لگانے کی سزا

۳۔ لعان کی سزا

۴:۔ حضرت عائشہ کی واقعہ افک سے براءت

۵۔ شیطان کی پیروی سے ممانعت

۶۔ گھروں میں داخل ہونے کے لئے اجازت طلب کرنا

۷۔ نگاہ جھکانا

زنا و بد کاری کی سزا

اسلام کے حرام کردہ امور میں بدکاری بھی ہے۔ وہ گناہ کبیرہ میں ہے، اور ایسا گناہ ہے، جس کے اثرات دنیا اور آخرت میں نمایاں انداز میں ظاہر ہوتے ہیں، حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگو! زنا سے بچو، کیونکہ اس میں چھ خرابیاں ہیں، تین دنیا میں اور تین آخرت میں، دنیا میں اس کی وجہ سے چہرے کا نور زائل ہوجاتا ہے، فقر وفاقہ چھا جاتا ہے، اور عمر میں کمی ہوتی ہے، اور آخرت میں اللہ کی ناراضگی حصہ میں آتی ہے، سخت حساب وکتاب کا سامنا ہوگا اور جہنم کے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ (البحر المدید مؤلفہ أحمد بن محمد ص ۵۷ ج ۵)۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے دریافت کیا: کون سا گناہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ سنگین ہے؟ رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا: تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ، پھر پوچھا: پھر کون سا ؟ فرمایا: فقر وفاقہ کے ڈر سے اپنے بچے کو قتل کیا جائے ، پھر پوچھا: کون سا؟ فرمایا: پڑوسی کی بیوی کے ساتھ زنا کرو۔

(بخاری۔سورۂ بقرہ، ج۴/ص۱۶۲۶)

پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا :

یہ بھی گناہ کبیرہ میں ہے ، بخاری شریف کی روایت میں رسول اللہ ﷺ نے اسے سات ہلاک کرنے والے امور میں شامل فرمایا ، ان میں ایک شرک ، دوسرے جادو ، تیسرے قتل نفس، چوتھے سود کھانا، پانچویں یتیم کا مال ناحق کھانا، چھٹے جنگ کے دن راہ فرار اختیار کرنا، ساتویں پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا۔ (صحیح بخاری، باب رمی المحصنات ج۶/۲۵۱۵) ۔

لعان اور اس کی سزا :

مدینہ منورہ میں ایک واقعہ پیش آیا تھا کہ ہلال بن امیہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا: یارسول اللہ! میں نے فلاں کو اپنی اہلیہ کے ساتھ دیکھا ہے، اگر میں چار گواہ لانے میں دیر کرتا تو بات آگے نکل جاتی ، اور اگر میں ناگاہ قتل کرتا تو اس پر زیادتی ہوتی ، اس موقع پر یہ لعان کی آیتیں نازل ہوئیں (والذین یرمون أزواجهم ولم يكن شهداء الا أنفسهم ، فشهادة أحدهم أربع شهادات بالله انه لمن الصا دقين ، والخامسة أن لعنة الله عليه ان كان من الكاذبين ويدرء وا عنها العذاب أن تشهد أربع شهادات بالله انه لمن الكاذبين والخامسة أن غضب الله عليها ان كانت من الكاذبين (نور : ۶۔۹) (جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگاتے ہیں اور ان کے پاس گواہ نہیں ہیں سوائے ان کی ذات کے، تو چار بار قسمیہ گواہی دیں کہ وہ اپنے دعوی میں سچے ہیں، اور پانچویں بار اس جملہ کا اعادہ کریں کہ اگر وہ جھوٹے ہیں تو ان پر اللہ کی لعنت ہے، اس کے جواب میں مدعی علیہا یہ گواہی دے گی چار بار کہ اس کے خلاف دعوی کرنے والا جھوٹا ہے، اور پانچویں بار یہ کہے گی کہ اس پر اللہ کا غضب ہو اگر وہ جھوٹی ہے)۔

واقعہ افک اور اس کی معنویت :

اس سورت کا ایک نمایاں حصہ واقعہ افک (حضرت عائشہ کی براءت) ہے، قرآن کریم نے کئی آیتوں میں اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا، بظاہر ایک واقعہ تھا، لیکن حقیقت میں ایک سازش تھی ناموس رسول ﷺ کے خلاف ، بلکہ خاندان رسول اللہ ﷺ کے خلاف۔

جنگ دو پیمانہ پر لڑی جاتی ہیں، ایک میدانی سطح پر اور دوسرے نفسیاتی، نفسیاتی جنگ زیادہ اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتی ہے، قرآن نے اس واقعہ سے معاشرہ میں پنپنے والے مرض کو صحیح کردار کے ساتھ حل کرنے کا ایک اسوہ دیا ہے، اس کی روشنی میں صالح معاشرہ کی تشکیل کی جاسکتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے کس طرح سے اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد معاملہ فرمایا اس کا مطالعہ سماجی برائیوں کو ہوا نہ دینے میں مفید ہوگا، خاص طور سے جب فتنہ وفساد کا غلبہ ہو تو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔

شیطان کے نقشہائے قدم کی پیروی کرنا

دنیا کی سب سے خطرناک چال شیطان کی چال ہے،

شیطان انسان کے دل میں ہر وقت کچو کے لگا تا رہتا ہے، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف شیطان حملہ کرتا ہے تو دوسری طرف فرشتہ، شیطان کا حملہ خیر کو چھوڑنے اور شر کو اختیار کرنے سے متعلق ہوتا ہے، اور فرشتے کا حملہ شر سے دور رہنے اور خیر کو اختیار کرنے سے متعلق ہے۔

گھروں داخل ھونے کے لئے اجازت لینا :

معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے قرآن نے یہ اصول دیا کہ کسی کے گھر میں انسان جانے کا ارادہ کرے تو اجازت طلب کرلیا کرے، اور اگر اپنے گھر میں بھی داخل ہوتو سلام کر لیا کرے، یہی مناسب طریقہ ہے جس سے معاشرتی نظام درست ہوگا، اور لوگوں کو بھی سکون حاصل ہوگا۔

نگاہ جھکانا :

انسانی معاشرہ کو حرام چیزوں سے بچانے کے لئے ایک مناسب نسخہ غض بصر ہے، انسان اگر منکر کی طرف نظر نہیں کرے گا تو گناہ میں مبتلا نہیں ہوگا، اس حکم میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں، قرآن نے دونوں صنفوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اجنبی مرد اور اجنبی عورت کے سامنے اپنی نگاہوں کو جھکائے رکھیں، نہ مرد عورت کو دیکھے، نہ عورت مرد کو دیکھے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم ، ذلك أزكى لهم ، ان الله خبير بما تعملون ، وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن و يحفظن فروجهن ، ولا يبدين زينتهن الا ما ظهر منها وليضربن بخمر هن على جيوبهن (نور:۳۰۔۳۱)۔

یہ آداب واطوار انسانی زندگی کے صلاح وبہتری میں مؤثر ثابت ہوتے ہیں، اگر ان کی پابندی کرلی جائے تو ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جو ضمیر کے احتساب کے ساتھ کائنات کے احتساب کا درس دے گا، صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے ان اصولوں کو برتا تو ان کی زندگی خیر وفلاح کا سرچشمہ ہوگئی، ذیل میں دو واقعات نفس کے احتساب اور ضمیر کی ملامت سے متعلق ذکر کئے جاتے ہیں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''ہمارے سامنے معتبر مؤرخین نے اس سلسلہ میں اسلامی تاریخ کے ایسے عجیب وغریب واقعات پیش کئے ہیں، جن کی نظیر اسلام کی دینی تاریخ کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتی، ان واقعات میں سے ایک ماعز بن مالک اسلمی کا واقعہ بھی ہے، جس کو امام مسلمؒ نے اپنی جامع صحیح میں نقل کیا ہے، رسول اللہ ﷺ کے پاس وہ حاضر ہوئے اور کہنے لگے یارسول اللہ! مجھ سے خطا ہوئی ہے، میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں، اور میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ کو پاک کروادیں، آپ نے ان کو واپس کردیا، دوسرے دن وہ پھر آئے اور کہنے لگے، یارسول اللہ! میں زنا کا مجرم ہوں، آپ نے دوبارہ پھر واپس کردیا اور ان کے گھرانے سے دریافت کیا کہ ان کی سمجھ میں کسی قسم کی کوئی خرابی تو نہیں یا کوئی عادت کے خلاف بات تو نہیں پائی جاتی۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو صرف اسی قدر جانتے ہیں کہ وہ سمجھ دار اور اچھے خاصے آدمی ہیں، پھر تیسری بار ماعز بن مالک آئے، آپ نے دوبارہ دریافت کرایا، جواب یکساں ملا، چوتھی بار جب وہ آئے تو آپ نے نصف دفن کرواکر سنگسار کردینے کا حکم دیا۔

اس کے بعد غامدیہ آئیں، کہنے لگیں: یارسول اللہ! مجھ سے زنا کی غلطی ہوگئی ہے، طاہر کروادیجئے، آپ نے ان کو واپس کر وادیا، دوسرے روز پھر آئیں، اور کہنے لگیں: آپ ہمیں کیوں واپس کرتے ہیں، شاید اسی طرح جس طرح ماعز کو واپس کرتے تھے، یا میں حاملہ ہوں، آپ نے فرمایا: تو پھر جاؤ، جب ولادت ہوجائے تو آنا، ولادت سے جب فارغ ہوئیں تو پھر آئیں، لڑکا کپڑے میں لپٹا ہوا تھا، کہنے لگیں، یہ میرا بچہ ہے۔ آپ نے فرمایا: جاؤ، دودھ پلاؤ، جب کچھ کھانے لگے تو لانا، جب دودھ چھڑایا تو پھر آئیں لڑکے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا، کہنے لگیں، اے اللہ کے نبی! میں دودھ پلانے سے بھی فارغ ہوگئی، اور یہ کھانا بھی کھانے لگا، آپ نے لڑکا ایک مسلمان کے سپرد کیا، حد قائم کرنے کا حکم فرمایا، ان کے سینہ تک گڑھا کھودا گیا، اور آپ نے حکم فرمایا، لوگوں نے سنگسار کردیا، خالد بن ولید نے ایک پتھر مارا تو خون کی چھینٹیں ان پر آکے پڑیں تو انہوں نے مذمت کے لفظ کہے، آپ نے یہ الفاظ سن لئے اور فرمایا: ہائیں خالد، اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ ایسی توبہ چنگی والا کرتا تو بخش دیا جاتا، پھر آپ نے حکم دیا، نماز پڑھی گئی اور ان کو دفن کردیا گیا (صحیح مسلم، کتاب الحدود) (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر: ۱۰۶ مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۱۳ہواں ایڈیشن ۲۰۰۰ء)

معاشرتی اصلاح کے بنیادی شرائط:

''قوموں کی ترقی کا اصول ہمیشہ ایک رہا ہے، چند حقیقتوں پر مستحکم یقین اور اس کے یقین کے مطابق عمل، اور کامیابی کے لئے مسلسل جدوجہد، سعی ومحنت اور اس راہ میں جو تکلیف پیش آئے اس کو ہنسی خوشی جھیل لینا، زمانہ کی اصطلاحیں بدلتی رہتی ہیں، لیکن اصطلاحوں کے بدلنے سے حقیقتیں نہیں بدلتیں، اسلام کی اصطلاح میں اس مستحکم یقین کا نام ایمان، اور اس کے مطابق عمل کا نام عمل صالح، اور مسلسل جدوجہد اور سعی ومحنت کا نام جہاد اور اس کے لئے پامردی کا نام صبر وثابت ہے، دنیا میں جب بھی کسی قوم کو کامیابی ہوئی ہے تو اسی اصول کے مطابق ہوئی ہے، اور جب ہوگی تو اسی اصول کے مطابق ہوگی''۔ (شذرات سلیمانی ج ۳/۱۹۱ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۸)

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رقم طراز ہیں:

''اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، اس لئے قرآن نے جابجا معاشرتی برائیوں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور ساتھ ہی اس کا علاج بھی تجویز کیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربی وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی، یعظکم لعلکم تذکرون (سورہ نحل: ۹۰) اللہ انصاف اور احسان سے کام کرنے اور رشتے داروں کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے، وہ بے حیائی، ناپسندیدہ بات اور سرکشی سے روکتا ہے، تمہیں وہ نصیحت کرتا ہے، شاید کہ تم نصیحت پاجاؤ۔

اس آیت کریمہ میں معاشرتی برائیوں کو تین بڑے بڑے عناوین میں تقسیم کیا گیا ہے، جو یہ ہیں: ۱۔فحشاء (بے حیائی کے کام) ۲۔منکرات جس سے پوری جماعت کی زندگی متاثر ہو، ۳۔بغی یعنی سرکشی، جیسے چوری، قتل، ڈاکہ اور ملک وقوم سے غداری کے کام، یہ وہ اخلاقی برائیاں ہیں، جن کو ہر مذہب اور

ہر انسانی معاشرت نے یکساں طور پر برا کہا ہے، وہ درحقیقت برائی اور بے حیائی کے کام ہیں، اور دین وشرافت کی نگاہ میں وہ سب برائیاں گناہ اور ناپسندیدہ باتیں ہیں ، اگر ان کو جائز قرار دے دیا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے امان اٹھ جائے، اور کسی کی جان، مال، اور عزت وآبروسلامت نہ رہے، قرآن مجید میں اس ضمن میں اخلاق کا معتدل نظام پیش کیا گیا، وہ اخلاق جو خدا کو پسند ہیں فضائل کہلاتے ہیں، اور جن کو خدا ناپسند کرتا ہے ، ان کو رذائل کہتے ہیں ، قرآن مجید میں جن فضائل اخلاق کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں: تقوی ،شرم وحیا، عدل وانصاف، درگذر۔

اس کے علاوہ معاشرتی خرابیاں جس چیزوں سے دور ہوسکتی ہیں، قرآن مجید نے ان کی تفصیل بتائی ہے وہ یہ ہیں: تقوی، اخلاص، توکل، صبر وشکر۔

تقوی نام ہے دل کی پاکیزگی اور عمل صالح کا، اخلاص نام ہے دیانت داری کا، توکل خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں، اور صبر تمام شیطانی طاقتوں پر قابو پانے کو کہتے ہیں ،تقوی سے عظمت نفس پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان کا ضمیر بیدار ہوتا ہے، اسی لئے اسلام نے برتری کا معیار تقوی کو قرار دیا ہے، اخلاص خدا کی خوشنودی اور بجا آوری کو کہتے ہیں، ظاہر ہے اگر انسان میں پرہیز گاری اور زندگی سے خلوص پیدا ہو جائے تو سماج معاشرتی برائیوں سے پاک ہوسکتا ہے، کیونکہ جس میں اللہ کا خوف ہوگا وہ نہ بددیانتی کرے گا، اور نہ کسی کی حق تلفی کرے گا، نہ اس کے قول وعمل میں تضاد ہوگا، اور نہ وہ اپنے فرائض منصبی سے پہلو تہی کرے گا، اسی طرح توکل اور صبر کامیابی کی اصل بنیاد ہیں ، مشکلات اور مصیبتوں کو برداشت کرنا، مصائب کا پامردی سے مقابلہ اور ضبط نفس سے کام لینا کسی قوم اور ملک کی ترقی کا زینہ ہیں''۔ (قرآن کریم انسانی زندگی کا رہبر کامل: ۲۲۳۔۳۲۷)۔

ان دونوں اقتباسات سے معاشرتی بیماریوں کو دور کرنے کا صحیح لائحہ عمل سامنے آتا ہے ، اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اگر معاشرے میں عدل، احسان (عمدہ کام کرنے کا جذبہ) اور حق داروں کو دینے کا مزاج پیدا ہو جائے تو زیادتی ، ہر قسم کی برائی اور بے حیائی سے دور رہنے کا بہترین نسخہ سامنے آئے گا۔

سورہ نور سے حاصل ہو نے والے چند نتائج:

(۱) ترغیبی پہلو، پھر اسباب ووسائل پر بندش، پھر سزاؤں کا اجراء، یہی جرائم پر قابو پانے کا فطری طریقہ ہے۔

(۲) اسلامی سزائیں جرائم کی روک تھام میں ہر لحاظ سے مؤثر ہیں۔

(۳) معاشرہ کے افراد ایک دوسرے سے حسن ظن رکھیں، تو معاشرتی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

(۴) نگاہ جھکانے سے انسان بہت سے مفاسد سے محفوظ ہوتا ہے۔

(۵) شیطان کی پیروی گمراہی کی طرف لے جانے والی ہے۔

(۶) شادی وقت پر کردینے سے معاشرے میں سماجی مسائل کا ازالہ ہوگا۔

(۷) ایمان اور عمل صالح زمین میں خلافت عطا کرنے کرنے والے ہیں۔

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

عقیقہ کے شرعی احکام

محمد قمر الزماں ندوی

عقیقہ کی تعریف اور اس کی حقیقت

''عقّ'' کے معنی کاٹنے کے ہیں، جو جانور نومولود کی طرف سے ذبح کیا جائے اس کو''عقیقہ'' کہا جاتا ہے، اسی طرح ماں کے پیٹ سے بچّہ کے سر پر جو بال اُگا ہوتا ہے اسے بھی عقیقہ کہتے ہیں، کیونکہ پیدائش کے بعد اسے کاٹ دیا جاتا ہے۔ (النھایہ۳/ ۲۷-۲۷، بحوالہ قاموس الفقہ جلد۴)

عقیقہ کی حکمت و مصلحت

زمانۂ اسلام سے پہلے بھی عربوں میں عقیقہ کا رواج تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو باقی رکھا۔ اہلِ عرب اپنی اولاد کا عقیقہ کیا کرتے تھے، کیونکہ عقیقہ میں بہت سی مصلحتیں تھیں، جس کا فائدہ خاندان، غیر خاندان اور خود عقیقہ کرنے والوں کو بھی تھا، منجملہ ان مصلحتوں کے چند یہ ہیں:

(۱) عقیقہ میں نہایت خوبی کے ساتھ اولاد کے نسب کی اشاعت ہوتی ہے اور اشاعتِ نسب ایک ضروری چیز ہے تاکہ کوئی شخص اس کی نسبت ناپسندیدہ بات نہ کہے اور یہ بات نامناسب تھی کہ بچّہ کا باپ گلی کوچوں میں پکارتا اور اعلان کرتا پھرے کہ اولاد ہوئی ہے، پس اشاعت و اطلاع کے لئے یہی طریقہ زیادہ مناسب ہوا۔

(۲) عقیقہ کے اندر ایک طرح کی سخاوت کا اظہار اور بخل کی صفت کا انکار پایا جاتا ہے۔

(۳) ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ نصاریٰ (عیسائی) میں جب کسی کے یہاں بچّہ پیدا ہوتا تو اس کو زرد پانی سے رنگا کرتے تھے اور اس کو''عمویہ'' کہتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ اس کے سبب وہ بچّہ نصرانی ہو جاتا ہے۔ اسی نام کے ساتھ مشاکلت کے طور پر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی سورۂ بقرہ میں فرمایا کہ:

''صبغة الله و من أحسن من الله صبغة'' ہم نے قبول کر لیا رنگ اللہ کا (یعنی دینِ حق) اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے۔

تو مناسب ہوا کہ دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی نصاریٰ کے مقابل کوئی ایسا امتیاز پایا جائے جس سے اس فرزند (بچّہ) کا حنیفی یعنی اسلامی اور ملتِ ابراہیمی و اسماعیلی کا تابع ہونا معلوم ہو اور جس قدر افعال حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خاص تھے اور برابر ان کی اولاد میں چلے آئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور واقعہ حضرت ابراہیمؑ کا اپنے بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہونا اور پھر خدا تعالیٰ کا اس کے بدلے میں ذبحِ عظیم (قربانی) کے ساتھ انعام کرنا

ہے اور ان یادگاروں میں سے زیادہ مشہور یادگار حج ہے جس کے اندر سر کے بال منڈانا اور ذبح کرنا ہوتا ہے، پس ان باتوں میں ان کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا اس بات کی علامت ہے کہ ہم اور ہماری اولاد ملتِ حنفی (حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین) پر جو کہ اسلام ہے، اس پر قائم ہیں۔

(۴) یہ مصلحت بھی معلوم ہوتی ہے کہ عقیقہ شروع پیدائش میں کرنے سے اس بات کا خیال پیدا ہوتا ہے کہ گویا اس نے بچہ کو خدا کی راہ میں دے دیا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بچّے کے ساتھ کیا تھا۔ (حضرت اسماعیلؑ کو شروع ہی میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کیا تھا)

اسی میں سلسلۂ احسان اور نیاز مندی اور فرمانبرداری کو حرکت دینا بھی معلوم ہوتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ، ج-۱، صفحہ ۵۰۸)

عقیقہ اور أسوۂ نبویؐ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیقہ کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ ہر بچہ عقیقہ کی وجہ سے گروی ہوتا ہے، اس لئے ساتویں دن اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے اور اس کے بال کاٹے جائیں۔ (سنن دارمی)

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکے کی طرف سے دو اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا ذبح کرنے کا حکم فرمایا۔ (ترمذی ۱/ ۲۷۸)

حضرت ام کرزؓ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ بکرے ہوں یا بکری، دونوں سے عقیقہ کیا جا سکتا ہے، نر اور مادہ کا کوئی فرق نہیں، (ترمذی)۔ تاہم خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسنؓ کا عقیقہ ایک بکرے سے کیا ہے۔ (ترمذی)

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت حسنؓ و حسینؓ دونوں ہی کا عقیقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک مینڈھے سے کیا ہے۔ (ابوداؤد)

عقیقہ کا شرعی حکم

عقیقہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک سنتِ مؤکدہ ہے، جبکہ امام احمد بن حنبلؒ کی ایک روایت وجوب کی بھی ہے اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک مستحب ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی طرف یہ بھی منسوب ہے کہ آپ اسے محض (صرف) مباح قرار دیتے تھے، لیکن امام طحاویؒ سے اس کا مستحب ہونا منقول ہے اور یہی صحیح ہے، اس لئے کہ کثرت سے روایات (احادیث) عقیقہ کے سلسلے میں موجود ہیں، واقعہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اس کے وجوب کی نفی کی ہے، لیکن جو لوگ امام ابوحنیفہؒ کی طرف بدعت کا قول منسوب کرتے ہیں وہ حضرت امام اعظم پر افتراء کرتے ہیں۔

علماء نے فرمایا کہ اگر قدرت (گنجائش) کے باوجود عقیقہ نہ کرے تو شفاعت سے محروم رہے گا۔

عقیقہ کس دن کرے؟

ساتویں دن عقیقہ کرنا، نام رکھنا، بال منڈانا اور بال کے ہم وزن چاندی صدقہ کرنا مسنون ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا، عقیقہ دن کے وقت کرنا بہتر ہے، اگر بچہ کی پیدائش رات میں ہوئی تو صبح سے ساتویں صبح کو عقیقہ کرے اور اگر دن میں پیدائش ہوئی ہو تو یوم پیدائش کو چھوڑ کر دوسرے دن سے ساتواں دن شمار کرے، عقیقہ کی قربانی طلوع آفتاب کے بعد مستحب ہے اور یہ بھی

مستحب ہے کہ ساتویں ہی دن نام رکھا جائے اور بال بھی منڈوائے جائیں۔

اگر ساتویں دن عقیقہ نہیں کر پایا تو چودھویں دن یا اکیسویں دن کرے، یہی حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، تاہم اگر ساتویں دن سے پہلے کرلے جب بھی درست ہے، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اگر مسنون وقت میں عقیقہ نہ کر پایا جب بھی عقیقہ کرنا چاہئے، البتہ امام مالکؒ کے نزدیک اکیسویں دن کے بعد عقیقہ نہیں۔ بہت سے علماء نے ساتویں دن کی تعداد کا لحاظ کر کے بالغ ہونے تک مدّت لکھی ہے، اور بہت سے حضرات نے کسی مدت کی قید نہیں لگائی۔

بچّہ کا عقیقہ کون کرے؟

جس کے ذمہ بچّہ کا نفقہ (ضروری خرچ) واجب ہے، اسی کے ذمہ عقیقہ بھی ہے، باپ کی حیثیت نہ ہو تو ماں عقیقہ کرے، اگر اس میں حیثیت (گنجائش) نہ ہو تو قرض لے کر عقیقہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ، جلد دھم، صفحہ ۶۱)

مرحوم بچّہ کا عقیقہ

عقیقہ زندگی میں کیا جاتا ہے، مرنے کے بعد عقیقہ کا مستحب ہونا ثابت نہیں، اگر مردہ بچّہ کے عقیقہ کو مستحب نہ سمجھا جائے، محض شفاعت کی امید اور مغفرت کی لالچ سے کر دیا جائے تو گنجائش معلوم ہوتی ہے جیسے کسی نے حج نہیں کیا اور بلا وصیت مر گیا اور وارث نے اس کی مغفرت کے امید پر اپنے خرچ سے حج بدل کیا، تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ اس صورت میں عقیقہ کا جانور الگ مستقل ہو، احتیاطاً قربانی کے جانور میں شرکت نہ کرے۔ (فتاویٰ رحیمیہ، جلد دھم، صفحہ ۶۲)

ساتویں دن عقیقہ کی حکمت و مصلحت:

عقیقہ ساتویں روز کرنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ پیدائش اور عقیقہ میں کچھ فاصلہ ہونا ضروری ہے کیونکہ سب گھر والے زچّہ (ماں) اور بچّہ کی خبر گیری میں شروع میں مشغول رہتے ہیں، ایسے وقت میں مناسب نہیں کہ ان کو عقیقہ کا حکم دے کر ان کا شغل یعنی کام اور زیادہ بڑھا دیا جائے، نیز لوگوں کو اسی وقت بکری (جانور وغیرہ) دستیاب نہیں ہوسکتی بلکہ تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے پس اگر پہلے ہی روز عقیقہ مسنون کیا جاتا تو لوگوں کو دقت ہو جاتی، اس لئے سات روز کا فاصلہ ایک کافی اور مناسب مدّت ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ، ج-۱/ص ۵۰۹)

مولانا منظور صاحب نعمانیؒ اس کی حکمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پیدائش ہی کے دن عقیقہ کرنے کا حکم غالبًا اس لئے نہیں دیا گیا کہ اس وقت گھر والوں کو زچّہ (ماں) کی دیکھ بھال کی فکر ہوتی ہے، علاوہ ازیں اسی دن بچہ کا سر صاف کرا دینے (بال کٹا دینے) میں طبی اصول پر ضرر (نقصان) کا بھی خطرہ ہے، ایک ہفتہ کی مدت ایسی ہے کہ اس میں زچہ بھی عموماً ٹھیک ہو جاتی ہے اور بچہ بھی سات دن تک اس دنیا کی ہوا کھا کر ایسا ہو جاتا ہے کہ اس کا سر صاف کرا دینے (بال کٹا دینے) میں نقصان کا کوئی خطرہ نہیں رہتا''۔

(معارف الحدیث جلد ۶ صفحہ ۲۶)

قربانی کے ساتھ عقیقہ کا حصہ

ایک ہی جانور میں قربانی اور عقیقہ کا حصہ ملا کر کیا جاسکتا

ہے، کیونکہ دونوں کا مقصد اللہ تعالیٰ کا تقرب اور اجر وثواب کا حاصل کرنا ہے، اس لئے فقہاء نے دونوں کو ایک ہی حکم میں رکھا ہے۔

بڑے جانور میں عقیقہ

جیسے قربانی میں ایک جانور میں کئی افراد کی شرکت ہوسکتی ہے، اسی طرح عقیقہ میں بھی ایک بڑے جانور میں اشتراک (شرکت) کی گنجائش ہے، اکثر فقہاء کے نزدیک اس طرح عقیقہ کرنا درست ہے۔ (مستفاد از کتاب الفتاویٰ جلد۴ صفحہ۱۷۰)

لڑکا اور لڑکی کے عقیقہ میں فرق اور اس کی وجہ: یوں تو لڑکے کے عقیقہ میں بھی ایک بکرے کا ذبح کردینا کافی ہے، اور خود آنحضرت ﷺ نے حضرت حسینؓ اور حضرت حسنؓ کے عقیقہ میں ایک ایک ہی بکری ذبح کی تھی، لیکن آپؐ نے بہتر طریقہ یہ بتایا کہ لڑکے کے لئے دو حصے ہوں اور لڑکی کے لئے ایک حصہ، جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی روایت گزر چکی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اصل میں تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی مصلحت کو بن سمجھے بے چوں چرا ماننا ہے، ضروری نہیں کہ ہر حکم شرعی کی مصلحت سمجھ میں آجائے، یا اس کی مصلحت وہی ہو جو ہم سمجھ رہے ہیں، لیکن بہر حال کوئی حکم شرعی ایسا نہیں جو عقل وحکمت کے خلاف ہو یا مصلحت سے خالی ہو۔

بظاہر اس کی یہ مصلحت سمجھ میں آتی ہے کہ لڑکا مستقبل میں انسان کے لئے اقتصادی (معاشی) خوش حالی کا باعث بنتا ہے اور شریعت والدین کی کفالت اس سے متعلق کرتی ہے، اس بنا پر اس کی پیدائش اللہ کے دوہرے شکر کا تقاضا کرتی ہے اور بندگانِ خدا کی زیادہ خدمت ہی کے ذریعہ اللہ کا زیادہ شکر ادا کیا جاسکتا ہے۔ (مستفاد از کتاب الفتاویٰ جلد۴ صفحہ۱۷۱)

کیا لڑکے کا عقیقہ میں ایک بکرا کافی ہے؟: اگر حیثیت ہو تو لڑکے کے لئے دو بکری یا دو بھیڑ یا دو دنبے یا قربانی کے جانور اونٹ، گائے، بھینس میں دو حصے افضل ہیں، ورنہ (گنجائش نہ ہو تو) ایک بکرا یا بڑے جانور میں ایک حصہ بھی کافی ہے، اس سے بھی عقیقہ ہوجاتا ہے، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے عقیقہ میں رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک ایک مینڈھے کی قربانی غالبًا اس لئے کی کہ اس وقت اتنی ہی وسعت تھی، اور اس طرح ان لوگوں کے لئے جن کو زیادہ وسعت حاصل نہ ہو، ایک نظیر بھی قائم ہوگئی۔

(مستفاد از معارف الحدیث ج۶ صفحہ۲۸)

عقیقہ میں بال کٹوانا اور اس کے ہم وزن صدقہ کرنا: عقیقہ کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ عقیقہ بچہ کی پیدائش کے ساتویں دن ہو، اسی دن بچہ کے بال جو پیدائش کے وقت اس کے سر پر تھے اس کو منڈا دینا افضل ہے، اور یہ بھی مسنون ہے کہ اس کے ہم وزن چاندی صدقہ کردی جائے، جیسا کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسنؓ کے عقیقہ میں ایک بکری قربان کی، اور آپؐ نے (اپنی صاحبزادی) سیدہ فاطمہؓ سے فرمایا کہ ''اس کا سر صاف کردو اور بالوں کے وزن بھر چاندی صدقہ کردو''۔ ہم نے وزن کیا درہم برابر یا اس سے کچھ کم تھے (بال)۔ (ترمذی)

بالوں کے ہم وزن صدقہ کی حکمت

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ بچہ کے بالوں کے ہم وزن چاندی

صدقہ اورخیرات کرنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بچہ کے بالوں کے برابر چاندی خیرات کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بچہ کا حالت جنبیہ (ناپاکی یعنی منی اورحیض وغیرہ کا گندہ خون) سے منتقل ہوکر بچپن کی طرف آنا، اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے تو اس پرشکر واجب ہے، اور بہترین شکر یہ ہے کہ اس کے بدلے کچھ دیا جائے، پیدائشی بال ناپاکی کی نشانی تھا، ان کا دور ہونا نشانات طفلیہ (بچپن) کے استقلال کی نشانی ہے، اس لئے صدقہ کرنا واجب ہوا کہ اس کے بدلہ چاندی (یا نقد رقم) دی جائے، اور چاندی کی خصوصیت یہ ہے کہ سونا گراں (قیمتی) ہے، سوائے امراء کے اور کسی کو دستیاب نہیں ہوتا ہے، اور چیزیں اس کے علاوہ ایسی نہیں ہیں کہ مولود بچہ کے بالوں کے برابر دے سکیں۔(حجۃ اللہ البالغہ)

حدیث کے بیان کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے صاحبزادہ حسینؓ (نواسۂ رسولؐ) کے بالوں کے وزن بھر چاندی صدقہ کرنے کا حضرت سیدہ فاطمہؓ کو جوحکم فرمایا تھا، بعض حضرات نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ حضرت حسینؓ کی پیدائش کے دنوں میں ان کے ماں باپ (حضرت فاطمہ وحضرت علی رضی اللہ عنہما) کے ہاں اتنی وسعت نہیں تھی کہ وہ عقیقہ کی قربانی کرسکتے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے بکری کی قربانی تو اپنی طرف (یعنی خرچہ) سے کردی، لیکن حضرت فاطمہؓ سے فرمادیا کہ ''بچے کے بالوں کے وزن بھر چاندی وہ صدقہ کردیں'' تاکہ ان کی (والدین کی) طرف سے بھی شکرانہ صدقہ کی شکل میں اللہ کے حضور میں گزرجائے۔(معارف الحدیث جلد۶ رصفحہ۲۹)

بچہ کے سر پر زعفران لگانے کا ثبوت

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا یہ دستور تھا کہ جب کسی کے لڑکا پیدا ہوتا تو وہ بکری یا بکرا ذبح کرتا اور اس کے خون سے بچے کے سر کو رنگ دیتا، پھر جب اسلام آیا تو (رسول اللہ ﷺ کی تعلیم وہدایت کے مطابق) ہمارا طریقہ یہ ہوگیا کہ ہم ساتویں دن عقیقہ کی بکری یا بکرے کی قربانی کرتے ہیں اور بچے کا سر صاف کراکے (منڈواکے) اس کے سر پر زعفران لگادیتے ہیں۔(ابوداؤدشریف)

آپ نے حکم فرمایا ''اجعلوا مکان الدم خلوقا''

یعنی بچے کے سر پر خون نہیں بلکہ اس کی جگہ خلوق لگایا کرو، ''خلوق'' ایک مرکب خوشبو کا نام ہے جو زعفران وغیرہ سے تیار کی جاتی ہے۔(معارف الحدیث جلد۶ رصفحہ۲۳)

عقیقہ کی دعا

عقیقہ کے لئے حدیث میں کوئی خاص دعا منقول نہیں، اگر اردو زبان میں بھی کہہ دے یا صرف نیت کرلے، کہ یہ فلاں کے عقیقہ کے طور پر ذبح کیا جارہا ہے، اے اللہ قبول کرلیجئے، تو کافی ہے، البتہ جانور ذبح کرتے وقت ''بسم اللہ، اللہ اکبر'' کہنا چاہئے، کیونکہ جانور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا ضروری ہے، بعض اہل علم نے عقیقہ کے مقصد ومنشا کو سامنے رکھتے ہوئے یہ دعائیہ کلمات کہنے کو لکھا ہے:

''اللھم ھذہ عقیقۃ ...... دمھا بدمہ وعظمھا بعظمہ وشعرھا بشعرہ، اللھم اجعلہ فدی لہ، اللھم منک ولک''

''اے اللہ! یہ (......کا) عقیقہ ہے اس جانور کا خون اس کے خون

،اس جانور کی ہڈی اس کی ہڈی اور اس جانور کا بال اس کے بال کے بدلہ ہے، اے اللہ! اس جانور کو اس کے لئے فدیہ بنادیجئے ، اے اللہ! آپ ہی کی طرف سے ہے اور آپ ہی کے لئے ہے''۔

اس کے بعد ''بسم اللہ، اللہ اکبر'' کہہ کر جانور کو ذبح کر دے، دعا کے یہ الفاظ لڑکے کے اعتبار سے ہیں، اگر لڑکی کا عقیقہ کرنا ہوتو ''بدمها ، بعظمها ،اور بشعرها، کہنا چاہئے ،دعا کے یہ الفاظ ذبح کرنے کے بعد بھی کہہ سکتے ہیں۔(کتاب الفتاویٰ جلد۴ رصفحہ ۱۷۸،۱۷۹)

عقیقہ کا گوشت

عقیقہ کے گوشت کی دعوت کرنا بھی درست ہے، کچا گوشت بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے، امام مالکؒ کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ گوشت کو تقسیم کردیا جائے، اور دعوت ان کے نزدیک مکروہ ہے۔

عقیقہ کا ایک تہائی گوشت مساکین کو تقسیم کر دینا افضل ہے، باقی دو تہائی اقرباء واحباب کی ضیافت میں خرچ کیا جا سکتا ہے، اگر تمام گوشت بھی ضیافت میں صرف کر دیا جائے تاہم عقیقہ ہوجائے گا، اگر چہ یہ خلافِ افضل ہے۔

عقیقہ کے گوشت کے متعلق مشہور ہے کہ بچے کے ماں، باپ، دادا، دادی، نانا، نانی نہ کھائیں، مگر یہ بات غلط ہے، شریعت مقدسہ میں اس کی کوئی اصل نہیں ، یہ سب لوگ کھا سکتے ہیں، (نیز) جانور کی جو عقیقہ میں ذبح کیا جائے ہڈیاں توڑنا جائز ہے، بعض لوگوں نے ہڈیاں توڑنے کو منع کیا ہے مگر اس ممانعت کے لئے کوئی سند نہیں ہے۔(مستفاد از کفایت المفتی ج۸ رصفحہ ۲۴۳)

شادی میں عقیقہ کے گوشت کا استعمال : عقیقہ کا گوشت تقریب عقد (شادی بیاہ) میں استعمال کر سکتے ہیں، امیر وغریب، اہل خانہ سب اس میں کھا سکتے ہیں، البتہ جس علاقے میں کھانے کے بعد کچھ لین دین کا رواج ہے، اس میں عقیقہ کا گوشت استعمال کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں گوشت کا عوض حاصل ہونے کا شبہ ہے اور عقیقہ کے گوشت پر عوض حاصل کرنا درست نہیں۔

مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ لکھتے ہیں:

''دعوت کا گوشت بلا کسی عوض کے مفت کھلانا چاہئے ،شادی کی تقریب میں چونکہ کھانا کھلا کر چڑھاوا (ہدیہ تحفہ) لیا جاتا ہے، اس لئے عوض (بدلہ) کا شبہ ہوتا ہے، لہٰذا بچنا چاہئے، ہاں جس دعوت میں چڑھاوا لینے کا دستور نہیں ہے، کھلانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، شادی کی دعوت میں عقیقہ کا گوشت کھلانے کا رواج (دستور) ہوجانے میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ استحباب (مستحب) کی رعایت نہ ہوگی۔مستحب یہ ہے کہ ساتویں روز عقیقہ ہو، اور تیسرا حصہ غرباء کو دیا جائے''۔ (فتاویٰ رحیمیہ جلد۶ رصفحہ۱۷۲)

عقیقہ کی دعوت میں تحفہ

عقیقہ کے موقع پر دعوت کرنا مباح ہے، سنت اور واجب نہیں ہے، عقیقہ کی دعوت میں تحفے اور تحائف کی رسمیں غریب اور تنگ دست رشتہ داروں اور مہمانوں کے لئے زحمت ہیں، اور اگر تحفہ نہ دیں تو ندامت وعار (شرمندگی) کا باعث ہوتا ہے، اس لئے حتی المقدور (کوشش بھر) ایسے رسوم اور رواج کو ختم کرنا چاہئے، ویسے چونکہ لوگ اس امر کو دین اور شریعت سمجھ کر نہیں کرتے، اور بذاتِ خود تحفہ کا لین دین جائز ہے، صاحب خانہ کی طرف سے طلب اور دباؤ بھی نہیں ہوتا، اس لئے اگر کوئی شخص تحفہ دے دے اور قبول کر لیا جائے تو گنجائش ہے، جو

سامان بچہ سے متعلق ہو، وہ اس ملکیت سمجھی جائے گی، جو والدین کے استعمال کی ہو، وہ اس کے والدین کی ملکیت سمجھی جائے گی، جو چیز نابالغ (بچہ) کی ملکیت میں آئے اس کا حکم یہ ہے کہ اسی بچہ ہی کے کام میں لگانا چاہئے، کسی کو اپنے کام میں لانا جائز نہیں، خود ماں باپ بھی اپنے کام میں نہ لائیں، نہ کسی اور بچہ کے کام میں لگائیں۔

بچہ کی تقریب میں جو دیا جاتا ہے اس کا حکم : ختنہ وعقیقہ وغیرہ کسی تقریب میں چھوٹے بچوں کو جو کچھ دیا جاتا ہے اس سے خاص اس بچہ کو دینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ ماں باپ کو دینا مقصود ہوتا ہے اس لئے وہ سب نیوتہ بچہ کی خوشی میں آئی ہوئی چیزیں اور نقد روپیہ بچہ کی ملکیت نہیں بلکہ ماں باپ اس کے مالک ہیں، جو چاہیں کریں، اختیار ہے۔

البتہ اگر کوئی شخص خاص بچہ ہی کو کوئی چیز دے (دینے والے کی نیت بچہ کو ہی دینے کی ہے، والدین سے بدلہ لینے کی نہیں ہے) تو پھر وہی بچہ اس کا مالک ہے، اگر بچہ سمجھدار ہے تو خود اس کا قبضہ کر لینا کافی ہے، جب قبضہ کر لیا تو مالک ہو گیا، اگر بچہ قبضہ نہ کرے یا قبضہ کرنے (یعنی لینے) کے لائق اور قابل نہیں ہے تو اگر باپ ہو تو اس کے قبضہ کر لینے سے اور اگر باپ نہ ہو تو دادا کے قبضہ کر لینے سے بچہ مالک ہو جائے گا۔ اگر باپ دادا نہ ہوں تو وہ بچہ جس کی پرورش میں ہے اس کو قبضہ کرنا چاہئے، اور باپ دادا کے ہوتے ہوئے ماں، نانی، دادی وغیرہ اور کسی کا قبضہ کرنا معتبر نہیں (یعنی لینا درست نہیں)۔ (مسائل عیدین وقربانی صفحہ ۲۳۶، ۲۳۷)

عقیقہ کے چند متفرق احکام

بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ عقیقہ کے ذبیحہ کا پاؤں دایہ کو دیا جائے اور اس روایت کو حضرت علیؓ سے نقل کرتے ہیں، عقیقہ کا جانور اسی عمر اور انہیں اوصاف کا حامل ہونا چاہئے جو قربانی کے لئے ضروری ہے، عقیقہ کے جانور کی قیمت صدقہ کرنے کے مقابلہ میں جانور ذبح کرنا افضل ہے، قربانی کی طرح اونٹ گائے اور بھینس میں بھی عقیقہ کے لئے حصہ لیا جا سکتا ہے، البتہ چونکہ احادیث میں بکرے کا ذکر ہے، اس لئے بکرے یا دنبہ سے عقیقہ بہتر معلوم ہوتا ہے، عقیقہ کے گوشت سے خود بھی کھا سکتا ہے غریبوں اور دوست واحباب سب کو کھلا سکتا ہے، البتہ اگر چمڑا یا کوئی حصہ فروخت کر دے تو اس کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ (مستفاد از قاموس الفقہ جلد ۴ر صفحہ ۴۱۱)

☆ لڑکے اور لڑکی کے عقیقہ میں جانور کے مذکر، مؤنث (نر، مادہ) ہونے کا فرق نہیں ہے، لڑکے کے عقیقہ میں بکری اور لڑکی کے عقیقہ میں بکرا ذبح کیا جا سکتا ہے مگر یہ فرق ہے کہ لڑکے کے عقیقہ کے لئے دو بکرے افضل ہیں اور لڑکی کے لئے ایک۔ (کفایت المفتی جلد ۸ر صفحہ ۲۴۱)

☆ عقیقہ کا ایک تہائی گوشت مساکین کو تقسیم کر دینا افضل ہے، باقی دو تہائی اقرباء واحباب کی ضیافت میں خرچ کیا جا سکتا ہے، اگر تمام گوشت بھی ضیافت میں صرف کر دیا جائے تاہم عقیقہ ہو جائے گا، اگر چہ یہ خلاف افضل ہے (بہتر نہیں ہے)۔ (کفایت المفتی جلد ۸ر صفحہ ۲۴۴)

☆ عقیقہ کا گوشت قربانی کے گوشت کی طرح کافر اور مشرک کو دیا جا سکتا ہے، عزیز الفتاویٰ میں ہے ’’عقیقہ کا گوشت اور قربانی کا گوشت کافر کو دینا درست ہے‘‘۔

(عزیز الفتاویٰ جلد ا رصفحہ ۲۱۷)

☆ جس جانور کی قربانی جائز نہیں ، اس جانور کا عقیقہ بھی درست نہیں اور جس کی قربانی درست ہے اس کا عقیقہ بھی درست ہے۔(شامی)

عقیقه کی رسمیں

عقیقہ کی شریعت میں حقیقت یہ ہے کہ عقیقہ کے روز لڑکے (ساتویں دن) کے لئے دو بکرے یا دو بکری اور لڑکی کے لئے ایک بکرا یا بکری ذبح کرنا اور اس کا گوشت کچا یا پکا کر تقسیم کر دینا اور بالوں کے برابر چاندی وزن کر کے (یا اس کی قیمت) خیرات کر دینا اور سر منڈانے (بال اتروانے) کے بعد زعفران بچہ کے سر میں لگا دینا بس یہ باتیں تو ثواب کی ہیں، باقی جو غیر شرعی باتیں رواج پا گئی ہیں یا جو فضولیات اس میں داخل اور شامل کر لی گئی ہیں ان سے ہم سب کو بچنا چاہئے اور عوام الناس کو روکنے کی حتیٰ المقدور تدبیر کرنی چاہئے، ذیل میں چند رسوم و رواج کا تذکرہ کیا جارہا ہے:

(۱) عقیقہ کے روز برادری اور خاندان و کنبے کے لوگ جمع ہو کر سر مونڈانے کے بعد کٹورے میں، بعض جگہ سوپ میں جس میں کچھ اناج (غلہ) رکھا جاتا ہے، کچھ نقد ڈالتے ہیں جو نائی یعنی بال کاٹنے والے کا حق سمجھا جاتا ہے اور یہ اسی گھر والے کے ذمہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ ان دینے والوں کے یہاں کوئی کام (خوشی و تقریب) پڑے جب ادا کیا جائے۔(جس کی خرابیاں بہت سی ہیں)

(۲) بہن وغیرہ (دھیانیاں) یہاں بھی وہی اپنا حق جو سچ پوچھو ناحق ہی لیتی ہیں، جس میں کافروں کی مشابہت کے سوا اور بھی کئی خرابیاں ہیں مثلاً دینے والے کی نیت کا خراب ہونا، کیونکہ یہ یقینی بات ہے، بعض وقت گنجائش نہیں ہوتی اور دینا گراں گزرتا ہے، مگر صرف نہ دینے میں شرمندگی ہوگی اور لوگ طعنہ دیں گے، مجبور ہو کر دینا پڑتا ہے، اسی کو ریا، نمود اور دکھلاوا کہتے ہیں، اور شہرت و دکھلاوے کے لئے مال خرچ کرنا حرام ہے۔

(۳) ان رسموں کی پابندی میں کبھی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے عقیقہ موقوف رکھنا پڑتا ہے اور مستحب کے خلاف کیا جاتا ہے، بلکہ بعض جگہ تو کئی سال بعد عقیقہ ہوتا ہے۔

(۴) ایک رسم یہ بھی ہے کہ جس وقت بچے کے سر پر استرا رکھا جائے فوراً اسی وقت بکرا ذبح ہو، یہ بھی محض لغو (غلط بات) ہے، سر مونڈنے کے کچھ دیر بعد ذبح کرے یا ذبح کر کے سر مونڈے، شریعت میں دونوں طرح کی اجازت اور گنجائش ہے۔غرض اس دن دونوں کام ہو جانے چاہئے۔ دونوں کا بالکل ساتھ ساتھ سمجھنا غلط ہے۔

(۵) عقیقہ میں ایک رسم یہ بھی چلی آرہی ہے کہ جانور کا سر نائی کو اور ران دائی کو دینا ضروری ہے، اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

(۶) بعض جگہ یہ دستور ہے کہ عقیقہ کے جانور کی ہڈیاں توڑنے کو برا اور غلط سمجھتے ہیں اور دفن کر دینے کو ضروری خیال کرتے ہیں، یہ بھی محض بے اصل بات ہے جس کا شریعت سے دور دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔(مستفاد از مسائل عیدین صفحہ ۲۳۵۔۲۳۶)

☆☆☆

تربیت اولاد (قسط-۱)

اپنی ذات اور اپنے جذبات کے تئیں بچے کا احساس

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نوٹ: اولاد کی تربیت ایک اہم دینی فریضہ ہے لیکن یہ زندگی کا سب سے مشکل ترین کام ہے، البتہ فرد، خاندان اور معاشرے کے لئے اولاد کی اچھی تربیت بہت اہم ہے، اس مشکل کام کو انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ والدین تربیت کے اصولوں سے واقف ہوں، اسلامی نقطۂ نظر کے ساتھ، نفسیات و معاشرت وغیرہ سے واقفیت رکھتے ہوں، اور اس سلسلہ میں وہ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں، یہ تحریر دراصل اسی فن تربیت کو اسلامی اور نفسیاتی تجربات کی روشنی میں آسان بنانے کے لئے پیش کی جارہی ہے، تاکہ والدین بچوں کی نفسیات سے واقف ہوکر اچھی طرح ان کی تربیت کرسکیں اور اپنی اس متاع بیش بہا کو اس طرح تیار کرسکیں کہ وہ خود ان کے لیے، معاشرے اور ملک وملت کے لئے مستقبل میں نفع بخش ومفید ہو، راقم کی نظر کئی کتابوں پر گئی، لیکن رفیق عزیز محمد الغزالی نے اس کتاب کا نام لیا جو ڈاکٹر مامون مبیض (جو خود ماہر نفسیات ہیں) نے "اولادنا" کے نام سے لکھی ہے، راقم کو جب یہ کتاب ہاتھ آئی تو اندازہ ہوا کہ اس میں برخلاف دیگر کتب کے اسلامیت ونفسیاتی، اصولوں کی تطبیق نیز ذاتی تجربات سے فائدہ اٹھا کر اچھا اور رہنما مواد پیش کیا گیا ہے، افادۂ عام کی غرض سے راقم نے اس کتاب کے مختلف حصوں کو ندائے اعتدال کے توسط سے اردو قالب میں پیش کرنے کا عزم کیا ہے، اللہ اس کام کو پورا فرمائے اور نفع عام کا ذریعہ بنائے۔ (ط-ا-ن)

بچہ مسلسل کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے، صبح کو جب سے اس کی آنکھ کھلتی ہے رات کو نیند کی آغوش میں جانے تک وہ گردش زمانہ، افراد خانہ اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے، بلکہ بچپن کا یہ زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ بچہ ہر زندہ شخص کے علاوہ مختلف اشیاء اور جمادات تک سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ضرور ہے، اس کی زندگی کے پہلے دو سال ایسے ہوتے ہیں جس میں وہ سوائے اپنے والدین کے کسی کو نہیں پہچانتا، کیوں کہ والدین ہی اس کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں، اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتے ہیں، لیکن عمر کے اس مرحلہ میں فطری طور پر بچے میں وہ حس پائی جاتی ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنے والدین اور دوسرے لوگوں کے مابین خوب فرق کرسکتا ہے، عمر کے تیسرے سال میں عام طور پر بچے میں یہ شعور پیدا ہونا شروع ہوتا ہے کہ کس چیز سے والدین خوش ہوتے ہیں اور کس چیز سے ناراض ہوتے ہیں، بچہ پورے طور پر ماں کے روز مرہ کے کاموں سے واقف ہونے لگتا ہے، اس کے رکھ رکھاؤ کو بھی پہچاننے لگتا ہے، یہ بھی سمجھنے لگتا ہے کہ ماں کس چیز سے ہنسے گی اور کیسے اس کے ساتھ کھیلنے پر آمادہ ہوگی اور اس کو قصے کہانی سنانے اور اس سے گفتگو کرنے کے لئے تیار ہوگی، وہ یہ بھی سمجھنے لگتا ہے کہ کیا کرنے سے ماں اس کو اپنی سہیلیوں اور رشتہ داروں کے پاس بھیجے گی، اس کی پریشانی کو کیسے بانٹے گی اور پریشانی و

الجھن میں کس طرح اس کے ساتھ نرمی وشفقت کا معاملہ کر کے اس کی مدد کرے گی، کیسے اس کو چھوڑ دے گی کہ وہ پانی سے اٹھکھیلیاں کرے، اور وہ کس طرح پیش آئے گی جبکہ وہ باورچی خانے میں اتھل پتھل مچائے گا یا کھانا زمین پر گرائے گا، مختصر یہ کہ اس مرحلہ میں بچہ ماں اور باپ دونوں سے بخوبی واقف ہونے لگتا ہے اور ان کے طریقوں کو سمجھنے لگتا ہے۔

عمر کے اسی مرحلہ میں بچہ اپنے ماں باپ کا دیگر افراد سے تقابل بھی شروع کر دیتا ہے، مثلا وہ اپنی ماں کی سیاہ زلفوں کا دادی کے سفید بالوں سے موازنہ کرتا ہے، کبھی اس کی نظر اس پر پڑتی ہے کہ اس کے والد تو خوش مذاقی اور خوش مزاجی کے ساتھ ہنستے رہتے ہیں جبکہ چچا اکثر سنجیدہ رہتے ہیں اور بہت کم ہنستے ہیں کبھی اس کی نظر اس پر جاتی ہے کہ اس کے والد اس حالت میں کس طرح گاڑی ڈرائیو کرتے ہیں جبکہ کہ پچھلی نشست پر دادی محترمہ تشریف رکھتی ہیں، غرض کہ اس طرح کے ہر موقع سے وہ کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے، حتی کہ اسے جو شام کو بستر پر لٹاتا ہے اور صبح کو جو اٹھاتا ہے، اور نیند سے پہلے جو لوریاں سناتا ہے اور جو بازار لے جاتا ہے ان سب سے بچہ سیکھتا ہے، اس طرح سے بچہ اپنے والدین سے مانوس ہوتا ہے اور بہت قریب سے ان کو پہچانتا ہے، اور ان کی خصوصیات کے ساتھ ہر روز کے ان کے رکھ رکھاؤ سے واقف ہوتا رہتا ہے، اس کی نظر والدین کے سلوک اور ظاہری کاموں نیز معمول کی گھریلو زندگی میں تغیر پر بھی رہتی ہے مثلا اگر کسی دن والد مرض وغیرہ کے سبب اپنے کام پر نہ جاسکیں تو بچہ اس تبدیلی کو بھی بغور دیکھتا ہے اور اس کے متعلق متعدد سوالات کرتا ہے۔

ان تمام تبدیلیوں اور تغیرات بالخصوص ابتدائی طور پر بچہ کا صحیح طور پر اپنے والدین سے واقف ہونا اس کی پرورش و پرداخت ونشو ونما میں بہت اہم ہے، اسی کے سبب بچہ اپنے والدین میں سے ہر ایک کو الگ اور منفرد انسان سمجھتا ہے جس کی اپنی الگ دنیا ہو، اس سلسلہ میں جب بھی آپ تجربہ کے لئے بچہ سے محو گفتگو ہوں گے اور اس کی ذہنی پرواز کو جانچنا چاہیں گے تو ہر مرتبہ آپ کو پہلے سے زیادہ بہتر وافضل تجربہ ہوگا۔

اس مرحلہ میں جو بات زیادہ قابل غور اور اہم ہے وہ یہ کہ بچہ والدین اور ان کی خصوصیات کو پہچاننے کے ساتھ اپنے آپ کو بھی صحیح طریقہ سے پہچانے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ صرف والدین کو جاننے اور ان کی نقل وحرکت پر غور کرتا رہے اور اپنی شخصیت وخصوصیات سے ناواقف رہ جائے، کیوں کہ بچہ کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ اس میں یہ احساس پیدا ہو کہ اس کی بھی اپنی شخصیت ہے، اپنی ترجیحات وخصوصیات ہیں، وہ اپنی دنیا کا خود بھی بادشاہ ہے، اس اہم ضرورت کے ساتھ یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ عمر کے اس مرحلہ میں بچہ کو صرف اپنی بعض جسمانی ضروریات کا احساس ہوتا ہے مثلا وہ بھوک کو محسوس کرتا ہے، سردی گرمی، تکلیف وتھکن اور خوشی وسکون کی حالتوں کا اس کو ادراک ہوجاتا ہے، عام طور پر عمر کے تیسرے سال میں بچہ ان جسمانی ضروریات کے علاوہ یہ بھی سوچنے لگتا ہے کہ وہ کون ہے؟ اسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ دوسروں سے الگ ایک انسان ہے، تفکیر واختیار پر اس کو قدرت ہے، اپنے آپ کو مطمئن کرنے کا بھی اس میں ملکہ پیدا ہونے لگتا ہے، وہ اپنے اندر اپنے آپ پر کنٹرول کرنے کی صلاحیت بھی محسوس کرتا ہے، یہ صحیح ہے کہ اس کو ابھی یہ شعور نہیں ہو پاتا کہ اپنے ان احساسات کو کلمات وعبارات میں بیان کرے مگر اپنی

ذات کے عرفان کا احساس ضرور ہونے لگتا ہے۔

یہاں جس بات کا ذکر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ بچے میں اپنی ذات کے عرفان کا احساس اس کے ساتھ والدین کے سلوک اور معاملہ کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے اپنے بارے میں احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ میں ایک مستقل انسان ہے لیکن اس انسان کی خصوصیات اور شخصیت کی جہات کا اس کو علم نہیں ہوتا، اسی لیے بچہ کو یہ احساس دلانے کے لئے کہ وہ اشرف وافضل اور ایک مکرم انسان ہے، ضروری ہے کہ والدین اس سے یوں کہیں ''تم تو اچھے بچے ہو'' اپنے اندر موجود اس کی محبت کا اس کو احساس دلائیں اور اس پر یہ واضح کریں کہ اس کا وجود والدین کی زندگی میں کتنی اہمیت کا حامل ہے، اس طرح اس کے اندر یہ شعور پیدا ہوگا کہ وہ افضل ومکرم ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ولقد کرمنا بنی آدم (الاسراء۷۰) اس کے برعکس اگر والدین اس سے یہ کہیں گے ''تم بہت برے ہو یا تم اچھے نہیں ہو'' یا اس کی حرکتوں پر بے صبری کا اظہار کریں گے اور اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ روانہ رکھیں گے اور اسے اپنی محبت کا احساس نہ دلائیں گے، اس کے جذبات اور جسمانی ضرورتوں پر خاطر خواہ توجہ نہ دیں گے تو اس میں یہ سوچ پیدا ہوسکتی ہے کہ وہ بے قیمت ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں یا یہ کہ وہ اچھوت ہے اس سے کسی کو کوئی رغبت نہیں۔

اگر بچہ میں یہ منفی سوچ پیدا ہوگیا تو پھر اسی کے مطابق اس کا ردعمل ہوگا اور اس سوچ کے نتیجہ میں وہ حزن وملال اور بے دلی کی کیفیت سے دوچار رہنے لگے گا، یا پھر وہ اپنا دفاع کرے گا اور یہ کوشش کرے گا کہ اس منفی رویہ کا سلسلہ ختم ہو اور والدین اس پر مزید توجہ دینا شروع کریں، لیکن اس کی یہ دفاعی کوشش سرکشی، نافرمانی اور عدم تعاون کی صورت میں رونما ہوگی، گویا وہ زبان حال سے یہ کہے گا ''میں مستقل طور پر ایک منفرد انسان ہوں، پوری وضاحت سے آپ لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو آپ لوگوں کی خواہشات کے حوالے نہیں کرسکتا'' ظاہر ہے کہ یہ بات بچہ الفاظ میں تعبیر کرنے سے قاصر ہوگا اس لیے وہ والدین کے فیصلوں اور خواہشات کی نافرمانی کرے گا اور اس نافرمانی کے ذریعہ وہ والدین کی اس توجہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جو اس کی اپنی دنیا اور اپنے وجود کی حفاظت کے لئے ضروری ہے، اس طرح وہ اپنے الگ تھلگ ہونے کے احساس کا دفاع کرے گا کیوں کہ فطری طور پر وہ والدین کے ساتھ اپنے خوشگوار تعلقات کو برقرار رکھنا چاہے گا اور ان سے محبت واحترام کا طلبگار رہوگا، اس میں یہ خواہش بھی شدید ہوگی کہ والدین اس کی قیمت واہمیت کا اس کو احساس دلائیں لیکن بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ عمر کے اس مرحلہ میں بچہ کے ان تمام احساسات کے باوجود اس کو یہ شعور نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ان جذبات واحساسات کا اظہار کس طرح کرے اور کس طرح والدین کی توجہ اور ان کا تعاون حاصل کرے۔

سطور بالا کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ بچے میں اپنے تئیں معرفت پیدا ہونے میں والدین کا کتنا اہم رول ہے، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ والدین بچے سے بڑی سختی اور غصہ سے بات کرتے ہیں اس پر قلق وخوف اور افسوس نہیں ہونا چاہیے البتہ شرط یہ ہے کہ وہ اس پر اپنی محبت واضح کرچکے ہوں، اپنی زندگی میں اس کی اہمیت بھی اس پر واضح کرچکے ہوں اور اس کے مصالح میں بڑی دوراندیشی برتیں، البتہ اس کے ساتھ یہ بہت ضروری ہے کہ اپنی اس دوراندیشی کے اظہار کے لئے بہت مناسب

کلمات اختیار کیے جائیں، ایسے الفاظ کا انتخاب کیا جائے جن سے بچہ متاثر ہو سکے، یہ بات سمجھنے کی ہے کہ الفاظ بہت طاقتور ذریعہ ہیں، چنانچہ اگر والدین نے بچے سے کہا ''تم جھوٹے ہو، برے ہو یا بہت عاجز کرتے ہو'' تو پھر بچہ اس کی تصدیق یوں کرے گا کہ وہ اس کو اپنی صفت بنانے کی کوشش کرے گا، ظاہر ہے کہ والدین بچہ کے مقابلہ میں بہت بڑے ہوتے ہیں ہر بات کو سمجھتے ہیں اور ہر سوال کا جواب دے سکتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اگر وہ اس طرح کے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں تو خطرہ ہے کہ بچہ اس کو اپنی انفرادی صفت اور اپنی شخصیت کے عنصر کے طور پر نہ استعمال کرنے لگے، اور ان الفاظ کو اپنی فکر میں اس طرح نہ شامل کرلے جیسے وہ اپنا نام اپنی عمر اور اپنے دراز یا پستہ قد کو یاد رکھتا ہے، یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ والدین کے بچوں کو اس طرح کے القاب سے ملقب کرنے اور اس طرح کے الفاظ ان کے لئے استعمال کرنے سے بچے ان افعال کے ارتکاب سے جن کو والدین ان کے لئے عیب سمجھتے ہیں ہرگز نہیں باز آئیں گے، کیوں کہ اس مرحلہ میں اس طرح اسکے اندر یہ احساس پیدا ہوگا کہ وہ ایک غیر محبوب اور برا انسان ہے۔

یہ بات اور زیادہ صحیح طریقہ پر سمجھ میں آجائے اور اس پر عمل ہو سکے اس کے لیے ضروری ہے کہ والدین ایسے الفاظ پر غور کریں اور اس کی فہرست بنائیں جو خود ان کی صفت کے طور پر استعمال ہوتے ہوں، ظاہر ہے کہ ان کا ذہن سب سے پہلے ان صفات کی طرف جائے گا جن کا استعمال آپسی تعلق کو بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے خواہ وہ تعلق بیوی سے ہو یا والدین سے، پھر کام اور پیشے میں استعمال ہونے والے الفاظ کا خیال آئے گا پھر وہ الفاظ آئیں گے جن سے قد اور صورت کا اندازہ ہوتا ہو، پھر اس کے بعد ان صفات کا ذکر ہوگا جن سے مثلاً لطف و راحت اور شوق وغیرہ کی عکاسی ہوتی ہو، اس فہرست کو تمام کرنے کے بعد ذرا اس میں ''حقیر، جھوٹا'' وغیرہ کے الفاظ کا اضافہ کرکے دیکھیں اور اندازہ کریں کہ جب یہ کلمات وہ سنتے ہیں تو ان پر کیا گزرتی ہے، جبکہ یہ معلوم ہے کہ یہ الفاظ صحیح نہیں اور ان سے ان کی شخصیت کی صحیح تصویر نہیں بن رہی ہے لیکن پھر بھی یہ الفاظ کیسے اثر انداز ہو رہے ہیں، سوچنے کی ضرورت ہے کہ اس بچے پر اس کا کیا اثر ہوگا جو آپ کی طرح حقیقت اور الفاظ کے درمیان تفریق کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا، لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ عملی طور پر آپ کے استعمال کردہ ان الفاظ کی بھی تصدیق کرے گا جیسے آپ سے وہ اور جو کچھ سنتا ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔

چنانچہ جب آپ بچہ کی کسی ناپسندیدہ بات پر تنبیہ کریں تو اس کی اس ناپسندیدہ حرکت کی نکیر کریں ارا اس کی شناعت اس پر واضح کریں نہ کہ اس طرح کے جملے استعمال کریں جس سے وہ اس کام کو عیب سمجھنے کے بجائے اپنے آپ کو معیوب انسان سمجھ بیٹھے، مثلاً بچے نے غلط حرکت کا ارتکاب کیا، اب اس سے یہ کہنے کے بجائے ''تم اچھے بچے نہیں ہو'' یہ کہا جائے کہ ''آج آپ نے جو کام کیا وہ اچھا نہیں ہے''، مثلاً بچے نے اپنے بھائی وغیرہ سے کوئی سخت بات کہہ دی یا دونوں میں کوئی درشت معاملہ ہو گیا تو اب اس سے یہ کہنے کے بجائے کہ تم ''سخت و درشت بچے ہو'' یہ کہا جائے کہ ''آپ نے اپنے بھائی کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بہت سخت ہے یا درست نہیں ہے۔''

بظاہر تو یہ بہت معمولی سا فرق ہے لیکن بہت مؤثر ہے، بالخصوص بچے کی نفسیات پر اس کا بڑا اثر پڑتا ہے، اسی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ بچے کو اس پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ عمر کے اسی مرحلہ سے اپنی شخصیت کو پہچانے اور اپنے آپ کو ایک علیحدہ انسان سمجھے اور اس طرح آپ اس میں اپنے حرکات وسکنات

پر قابو پانے کی قدرت پیدا کر سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کبھی کبھی آپ کے اندر سختی کا مادہ جوش مارتا ہے اور بہت غصہ آتا ہے لیکن ان حالات میں اپنے آپ پر یہ سوچ کر قابو پانا چاہیے کہ اکثر قساوت وغضب سے شر وفساد کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا، اس لیے بہتر ہے کہ آپ انسانی جذبات کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ سیکھنے کی کوشش کریں کہ ان کیفیتوں میں بھی آپ کس طرح کا سلوک کریں جس سے دوسروں کو کوئی تکلیف نہ ہو، اور اس پر توجہ دینی چاہیے کہ بچہ ظاہر ہے کہ ہر وقت نہیں سیکھتا لیکن اس کو اس پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ دھیرے دھیرے لیکن احترام ومحبت کی بنیاد پر اپنے آپ قبول کرتے ہوئے یہ سیکھے کہ اس کو اپنے ساتھ اور پھر دوسروں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرنا چاہیے، اس سلسلہ میں اصول کی بات یہ ہے کہ بچہ جن صفات کا حامل ہو اس کی ان ہی صفات کے ساتھ اس کو اپنا بچہ تسلیم کرتے ہوئے بہتر ترین بنانے کی کوشش کریں، اس طرح آپ بچے میں اچھا شعور اور اس کی اپنی ذات کے تئیں ایجابی اور مثبت سوچ پیدا کر سکتے ہیں، اس طریقہ سے وہ ایک مثبت فکر کا حامل، خوش بخت اور معاشرے کے لئے پر امن انسان بن کر تیار ہوگا، اور ایسا انسان ہوگا جس کی اپنے افعال وتصرفات پر نظر ہوگی اور اپنی زندگی کے لئے حکمت ومصلحت کے اختیار کا ملکہ ہوگا، اس کو عرفان ذات حاصل ہوگا، اسی لیے وہ اپنا احترام کرے گا اور پھر دوسروں کو سمجھتے ہوئے ان کا بھی احترام کرے گا، اس کو ایسی قدرت ہوگی کہ اس مرحلہ کے علاوہ مستقبل میں بھی آپ سے مخلصانہ طور پر اپنے تعلقات خوشگوار وبرقرار رکھے۔

بچے کی اچھی تربیت اور اس کی اچھی پرورش میں اس کا بڑا دخل ہے کہ والد اپنے اوقات کا وافر حصہ اس کے لئے خاص کریں تاکہ آئندہ زندگی خوشگوار ومفید بن سکے، ظاہر ہے اس طرح خود ایک والد اپنے لیے بہت کچھ سامان منفعت جمع کرنے کے ساتھ مستقبل کا سہارا تیار کرے گا۔

ہم میں سے ہر ایک اس کا خواہاں اور اس کے لئے کوشاں نظر آتا ہے کہ اولاد کے ساتھ اس کے تعلقات کامیاب و سودمند ہوں، اور ان تعلقات سے والدین واولاد دونوں اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں فائدہ اٹھا سکیں، یہ تعلقات ایسے استوار وخوشگوار ہوں کہ ان کے باعث امن وسکون حاصل ہو اور گھر جنت نشان نظر آئے، ہم میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بچہ والدین کا مطیع وفرمانبردار اور ان کے لئے معاون ہو، لیکن اس خواہش کی تکمیل کوئی کھیل تماشہ تو نہیں، اس کے لیے بہت محنت کی ضرورت ہوتی ہے، بڑا وقت درکار ہوتا ہے اور بڑے صبر سے گزرنا پڑتا ہے، البتہ اگر کوئی اس میں کامیاب ہوجائے تو پھر آنے والے سالوں میں بچے اور والدین دونوں کی زندگی بڑی پُر لطف وخوشگوار ہوتی ہے، بچہ والدین کی آغوش رحمت وتربیت میں اپنے بچپنے سے لطف اندوز ہوتا ہے تو والدین بھی اس کی پرورش و پرداخت کا مزہ اٹھاتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ والدین کے ذریعہ بچے میں یہ احساس پیدا کرنا کہ وہ بہت قیمتی انسان ہے اور بالکل مامون ہاتھوں میں ہے اس کی تربیت ہو رہی ہے، اور یہ کوشش کرنا کہ وہ اپنے افعال اور حرکتوں کو سمجھ سکے اور ان پر قابو پانے کا اس میں ملکہ پیدا ہو شخصیت کی تکوین کے لئے بہت اہم عنصر ہے، ساتھ ہی والدین واولاد کے درمیان خوشگوار ومفید تعلقات کیلئے بھی اس احساس کا وجود بہت مفید ومؤثر ہے۔　(......جاری)

☆☆☆

دردِدل

لہولہان ارضِ فلسطین کا پیغام

مسلم حکمرانوں کے نام

مفتی احتشام الحق قاسمی ......امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

اے عالم اسلام کے مسلم حکمرانو! خصوصا بلاد عربیہ کے شہزادو! عیش وعشرت کے متوالو!

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم وہ مقدس سرزمین ہیں جہاں سیکڑوں انبیاء کرام تشریف لائے، یہیں ان کا مسکن رہا اور آرام گاہ بھی ہے، جہاں اللہ کے اولوالعزم پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام اور پیارے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کا مقدس گھر بنایا، جسے بیت المقدس کہا جاتا ہے اور جسے قبلہ اول ہونے کا شرف حاصل ہے، جہاں سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں ملأ اعلیٰ کی سیر فرمائی اور انبیاء کرام خصوصا حضور پاک صلی اللہ علیہ کی جبین نیاز بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہوئی، جس کی خوشبو سے ذرہ ذرہ مشک بار ہوا، اسی مقدس سرزمین پر دنیا کے سب سے بڑے دہشت گرد، ظالم وسفاک، انسانیت کے دشمن، نالائق وبدبخت یہودیوں نے تباہی اور ہلاکت وبربادی کی جو تاریخ رقم کی ہے وہ کسی سے مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے، معصوم بچے اور بچیوں، بے گناہ ماؤں اور بہنوں، نہتے نوجوانوں بوڑھوں اور کمزوروں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی ہے، آشیانے اجاڑے جارہے ہیں، بچے یتیم ہو رہے ہیں، زخمی، زخموں سے کراہ رہے ہیں، مائیں اپنے بچے، شوہر اور عزیزوا قارب کے کھونے اور آشیانے کے اجڑنے کے غم میں سسک رہی ہیں: بچے اپنے ماں باپ سے محرومی کے غم میں بلک رہے ہیں، وہ کون سا زخم کون سا غم اور کون سی مصیبت ہے جو ہمارے سینوں میں نہیں ہے، ہمارے مکیں کوئی غیر نہیں بلکہ محمد رسول اللہ کے غلام ہیں اور تم ہی جیسے کلمہ گو مسلمان ہیں، تمہارے دینی واسلامی بھائی ہیں، ہماری پریشانیوں ومصیبتوں کی داستانیں سن کر ساری دنیا میں کہرام مچ گیا، ہر جگہ مسلمان سڑکوں پر آگئے اور بھیڑیا ودرندہ صفت ظالم اسرائیل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔لیکن ہماری چیخ وپکار آہ وبکا اور تباہی وبربادی کا اگر کوئی اثر نہیں ہوا دلوں میں کوئی حرکت وہلچل پیدا نہیں ہوئی تو وہ اسرائیل امریکہ اور اس کے ہمنوا تم جیسے مسلم حکمران ہو۔

اے مسلم حکمرانو! اسرائیلی، امریکی تو ازل ہی سے اسلام مخالف ہیں، اسلام اور مسلمانوں سے متعلق بغض وعناد مکر وفریب اور دشمنی تو شروع ہی سے ان کے سینوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔لیکن تم تو محمد رسول اللہ ﷺ کے غلام ہو اور

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلم برادری کو اخوت ومحبت اور بھائی چارگی کے بندھن میں ایسا باندھا ہے جسکی نظیر ملنی مشکل ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلم برادری کو خواہ وہ مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا،شمال کا کا رہنے والا ہو یا جنوب کا، دنیا کے جس گوشہ اور جس حصہ کا رہنے والا ہو سب کو جسم واحد کے مانند قرار دیا ہے، کانٹا پاؤں مین چبھتا ہے، اوہ، اف کے کلمات زبان سے نکلتے ہیں دل اس کی تکلیف کو محسوس کرتا ہے آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں، ہاتھ حرکت میں آتا ہے گویا جسم کے سارے اعضاء بیقرار ہوجاتے ہیں، اس کے درد، کرب اور ٹیس کو محسوس کرتے ہیں، لیکن ایک تم ہو کہ اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے درد وکرب کو محسوس نہیں کرتے، کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ درس گرانقدر تمہارے لئے نہیں ہے۔تم اس سبق کو کیوں بھول گئے ہو؟

ظلم کا دفاع، ظالموں کو ظلم سے اپنی طاقت بھر روکنا، پنجۂ ظلم کو مڑوڑنا اور مظلوموں کی دادرسی تمہارا ایمانی واسلامی فریضہ ہے۔کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تم نے نہیں پڑھا: **المسلم اخو المسلم لا یظلمه ولا یسلمه (صحیح البخاری ۱/ ۳۳۰)** مسلمان،مسلمان کا بھائی ہے نہ تو خود اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی کسی ظالم کے حوالہ اس کو بے یار ومدد گار چھوڑتا ہے۔کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک تمہارے پردۂ سماعت سے نہیں ٹکرایا۔**انصر اخاک ظالما أو مظلوما**. اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، ایک صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ! مظلوم کی مدد کی بات تو سمجھ میں آتی ہے ظالم کی مدد کی کیا شکل ہوگی؟ آپ نے فرمایا **تاخذ فوق یدیه**، ظالم کے ہاتھ کو ظلم سے روکو(یہی ظالم کی مدد کرنا ہے۔صحیح البخاری ۱/۳۳۱)

صحیح بخاری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جن سات چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ان میں ایک مظلوم کی مدد بھی ہے(حوالہ بالا)

مسلم حکمرانو! بتاؤ کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے مذکورہ فرامین کے مخاطب تم نہیں ہو! یہ ارشادات تمہارے لئے نہیں ہیں، کیا ظالموں کے ظلم پر خاموشی اختیار کرنا اور اس کو ظلم سے نہ روکنا ظالموں کا ساتھ دینا نہیں ہے؟ کیا تمہاری یہ مجرمانہ خاموشی اسرائیل کے ظلم وبربریت کو فروغ نہیں دے رہی ہے؟ کیا اس کے حوصلہ کو بلند وبے لگام نہیں کررہی ہے؟ آخر تم نے خاموشی کی راہ کیوں اختیار کی؟ کیا تمہارے سینوں میں دل نہیں ہے، جو فلسطینی مسلم بھائیوں کے لئے تڑپے، تمہارا دل مردہ کیوں ہو چکا ہے؟ ایمانی غیرت کہاں چلی گئی؟ تمہاری زبان گنگ کیوں ہوگئی ہے؟ اس ظلم وبربریت کے خلاف کیوں نہیں بولتی؟ گویائی کی طاقت کس نے سلب کرلی ہے؟ کیا تمہیں اس بات کا اندیشہ ہے کہ تمہارا آقا امریکہ واسرائیل جس کی بدولت تم برسر اقتدار ہو ناراض ہوجائے گا؟ تمہاری کرسی چھن جائے گی؟ لعنت ہو ایسی کرسی اور ایسے اقتدار پر جو تمہاری جرأت ایمانی، دلیری وبے باکی، گویائی اور دردمندی سب کچھ سلب کرلے، اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کا باغی وطاغی بنادے، سنو! اگر تم محمد رسول اللہ کے سچے غلام ہو، تمہارے دلوں میں ایمان کی ذرہ برابر بھی رمق باقی ہے تو ایمان کی اس چنگاری کو بھڑکاؤ، ایمانی غیرت کو جگاؤ، اپنی خاموشی توڑو اور کہہ

دو دنیا سے کہ انسانی خونوں سے ہولی بہت کھیلی گئی ، تباہی وبربادی بہت مچائی گئی، وحشت ودرندگی کا ننگا ناچ بہت ناچا گیا ،ظلم وبربریت کی تمام سرحدیں پار ہوگئیں،اب ہم نہ توظلم کریں گے اور نہ کسی حال میں ظلم سہیں گے، اعلان کردو مؤمنانہ شان اور ایمانی قوت وطاقت کے ساتھ پوری دلیری جرأت وبے باکی سے کہ ہم پوری مسلم امہ ایک کنبہ کے مانند ہیں کسی ایک مسلم ملک پرحملہ پورے مسلم ملک پرحملہ سمجھا جائے گا اور تمام ممالک اسلامیہ کواس کے دفاع کا حق حاصل ہوگا، اگر تمہارے اندراتنی ہمت وجرأت ہے تو تمہارا اقتدار تمہارے لئے مبارک ہو ورنہ چھوڑ دو اس عظیم منصب کو اور موقع دو کسی شجاع وبہادر بے باک صاحب ایمان کو۔ اے مسلم حکمرانو! ہم تو تباہ ہو ہی رہے ہیں، تم ہماری ہلاکت وبربادی کا تماشہ کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہو اور یہ سمجھ کر خاموش ہو کہ یہ مصیبت ابھی ہمارے گھر نہیں آئی ہے، خدا کرے یہ مصیبت تمہارے گھر نہ جائے اور تم امن وامان اور سلامتی کے ساتھ زندگی گزارو، لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تم اپنی صفوں میں اتحاد واتفاق کی عظیم طاقت اور باطل سے مقابلہ کی پوری استعداد وصلاحیت نہ پیدا کرلو، ورنہ سنو اور چلتے چلتے میری ایک بات یاد رکھو جس طرح کل تم نے افغانستان، عراق، بوسنیا، چیچینیا کی ہلاکت وبربادی کے تماشہ دیکھے اور آج ہماری ہلاکت وبربادی کا تماشہ دیکھ رہے ہو کل دنیا تمہاری ہلاکت وبربادی کا تماشہ دیکھے گی۔

☆☆☆

ہندوستان کے باشندوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ آج وہ زمانہ ہے جس میں ساری دنیا سمٹ کر ایک گھر میں جمع ہوگئی ہے، اور ساری قومیں مل جل کر آیندہ کا نقشہ بنا رہی ہیں، ایسی حالت میں ہندوستان کے کچھ لوگوں کا یہ خیال کہ وہ اپنی دنیا الگ بنائیں، اور ہزارہا سال پیچھے ہٹ کر پھر ملک کو ویسا ہی بنا دیں جیسا پہلے تھا، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ریل اور ہوائی جہاز کے اس دور میں پھر سے بہلی اور رتھ پر سوار ہو کر اپنا سفر شروع کر دیں، اور آپ دیکھیں گے کہ یہ تخیل ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہیں، بلکہ ہندوؤں اور ہندوؤں میں تفرقہ پیدا کر دے گا، اور اس باقی ملک کو بھی بیسیوں ملکوں میں تقسیم کر دے گا۔

(ماخوذ: شذرات سلیمانی)

دردِ دل

عالمِ اسلام کی بے حسی....

تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے!

محمد سراج الہدیٰ ندوی ازہری
استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمدﷺ کی نبوت کے بعد قیامت تک جتنے بھی افراد پیدا ہوں گے، ان سب کا شمار آپ ﷺ ہی کی امت میں ہوگا، اگر وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں تو امتِ اجابت کہلائیں گے اور اگر نہیں قبول کرتے ہیں تو انہیں امتِ دعوت کہا جائے گا۔ امتِ اجابت ہی کا دوسرا نام امتِ مسلمہ بھی ہے، اس امت کو ایک متحدہ امت بنانے کے لیے آپﷺ نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا اور اللہ کے فضل وکرم سے دین کی بنیاد پر اتحاد ویگانگت کا ایک ایسا عظیم نمونہ پیش کیا، جس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی، آپﷺ نے مومنوں کو ایک جسم سے تعبیر کیا ہے، آپ کا ارشاد ہے: ''کہ محبت ومودت اور رحم وکرم میں مومنوں کی مثال ایک جسم جیسی ہے، جس طرح ایک جسم کے کسی عضو کو تکلیف ہو، یا وہ بیمار پڑ جائے تو سارا جسم بخار و بے خوابی کا شکار ہو جاتا ہے'' (مسلم: ۲۵۸۶)۔

یہ حدیث امتِ مسلمہ کے متحد رہنے، ایک دوسرے کی پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھنے اور دوسروں کے آرام وسکون کی خاطر خود کو بے چین کر دینے کی ایک اعلیٰ تشبیہ وتمثیل ہے۔ الحمد للہ امتِ مسلمہ اسی نہج پر چلتی رہی، یہاں تک کہ دشمنوں نے اپنی سازشوں کے ذریعہ نبیﷺ کے انتقال کے بعد اسلام کے ایک مضبوط دروازے حضرت عمرؓ بن خطاب کو شہید کر دیا؛ لیکن اس کے بعد بھی امت اپنی چند سالہ خانہ جنگی کے باوجود عروج کی طرف بڑھتی گئی اور چند صدیوں تک پوری شان وشوکت کے ساتھ دنیا کے ایک بڑے رقبہ پر حکومت کی، یہاں تک کہ دشمنانِ اسلام یعنی یہود ونصاریٰ نے ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کے خلاف اہلِ عرب کو اکسایا اور انہیں مستقل چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا حاکم بنا دینے کا وعدہ کیا، پھر کیا تھا؟ شیطان نے ورغلایا، دشمنوں نے جوش دلایا، قومیتِ عربیہ کا ایک نیا خوشنما نعرہ ایجاد کیا گیا اور عہدہ ومنصب اور حکمرانی کے لالچ میں یہ لوگ یعنی اہلِ عرب ترکی کے خلاف بغاوت کر بیٹھے، یہاں تک کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی یعنی ۱۹۲۳ء میں اس عظیم خلافت کا خاتمہ ہو گیا اور یہ امتِ محمدیہ حکومتوں، ٹولیوں، زبانوں اور رنگ ونسل کے کئی خانوں میں بٹ گئی، جس امت کو نبیﷺ نے رات ودن کی انتھک کوششوں سے ایک لڑی میں پرو کر، تسبیح کا ایک دانہ بنا دیا تھا، وہ امت ایسی ٹوٹی اور بکھری کہ اب اسے اکٹھا کرنا مشکل ہو گیا ہے، ہر ملک بلکہ یہ کہا جائے کہ ہر مسلم حکمراں الگ الگ اپنی ڈفلی بجا رہا ہے، اسے دنیا کے مختلف خطوں کے مظلوم مسلمانوں کی کوئی فکر نہیں۔ نبیﷺ نے

تو فرمایا تھا کہ: ''اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم''، صحابہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! مظلوم ہو تو میں اس کی مدد کروں؛ لیکن اگر ظالم ہو تو مدد کرنے کا کیا مطلب ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس کو ظلم کرنے سے روکو، یہی اس کی مدد کرنا ہے'' (بخاری: ۶۹۵۲) اور ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص کسی برائی کو دیکھے تو اول اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے، اگر اس پر قادر نہ ہو تو زبان سے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل سے، یعنی دل سے برا سمجھے اور دل میں یہ ارادہ رکھے کہ اللہ تعالی جب بھی قدرت دیں گے، وہ اسے روکنے کی کوشش کرے گا'' (ابوداؤد: ۴۳۴۰)۔

اے میرے مسلم حکمرانو! اگر تم عام برائیوں اور ظلم و زیادتی کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتے ہو، تو کم از کم اپنے ان بھائیوں کی حمایت میں تو آواز اٹھاؤ، جنہیں نبی ﷺ نے ایک کلمہ کی بنیاد پر جوڑا ہے اور قرآن نے بہترین امت (خیرِ امت) کا لقب دیا ہے، یوں تو ظلم کے خلاف آواز اٹھانا، یا کم از کم برائی کو برائی سمجھنا، سماج کے ہر انسان کی ذمہ داری ہے؛ لیکن میں آپ حضرات سے اس وجہ سے مخاطِب ہوں کہ اللہ نے آپ کو مملکت وسلطنت دے کر آپ کی ذمہ داری دوبالا کردی ہے، وہ آپ حضرات سے پوچھے گا اور یقیناً پوچھے گا کہ فلسطین لہولہو تھا، غزہ کو شہرِ خموشاں بنایا جارہا تھا، معصوم بچوں کے نرم ونازک جسم خون میں لت پت تھے، بوڑھوں کے بڑھاپے پر رحم وکرم نہیں کیا جارہا تھا، عورتوں کی عزت وناموس نیلام کی جارہی تھی، ان کی عفت وعصمت کی چادریں تار تار ہورہی تھیں، ایک طرف فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ یہ ہورہا تھا، تو دوسری طرف ملکِ افغانستان میں مسلمانوں کے ناحق خون بہائے جارہے تھے، عراق میں اپنوں کو آپس میں لڑایا جارہا تھا، خودکش حملوں کے ذریعہ عام شہریوں کو ہلاک کیا جارہا تھا، مصر میں ایک دیندار باغیرت وباحمیت، صاحبِ ایمان کی منتخب حکومت کا تختہ چند بے دین وبے غیرت افراد کے ذریعہ پلٹ دیا گیا، اور اخوان المسلمون جیسی خالص اسلامی معتدل ومتوازن تحریک کو دہشت گرد قرار دیا گیا اور ہائے افسوس تم سب تماشائی بنے رہے، اس ظلم وزیادتی کو دیکھ کر ہمیں خون کے آنسو رونا پڑتا ہے، کلیجہ منھ کو آجاتا ہے؛ لیکن تم ہو کہ خوابِ خرگوش میں پڑے ہوئے ہو، اس بربریت کو دیکھ کر تمہارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، اتنے سنگ دل ہوگئے ہو کہ مظلوموں کی دردناک وکربناکی دیکھنے پر بھی تمہارا دل نہیں پسیجتا، اگر کبھی بہت احسان کیا تو مگر مچھ کے دو آنسو بہا لیے، کیا تمہیں قیامت کی یاد نہیں آتی، حساب وکتاب کا کبھی خیال نہیں آتا، ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا حساب وکتاب ہونا ہے، اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے، ایسا نامۂ اعمال ہوگا جو چھوٹے بڑے کسی بھی عمل کو نہیں چھوڑے گا، انسان حیران وپریشان اس کتاب کو دیکھتا رہ جائے گا (الکہف: ۴۹)۔

اے سربراہانِ عرب! عجم نے تو اپنی زبان کھولی، تحریر وتقریر کے ذریعہ حق کا اظہار کیا، ترکی کا مردِ آہن بول پڑا؛ لیکن قطر کے علاوہ تم سب کی زبانوں پر تالے پڑے رہے، تمہاری زیادتی تو اس حد تک ہوگئی کہ جب قطر نے اخوان المسلمون کا ساتھ دیا، اس کی حمایت میں بات کی، تو تم پورے خلیجی ممالک نے یک جُٹ ہوکر اس کا بائیکاٹ کردیا، اس سے تعلقات توڑ دیے۔ ذرا سوچو تو یہ کہاں کا انصاف ہے؟ تمہاری مالی امداد، رفاہی کام اور صدقات وخیرات کے ذریعہ دنیا بھر کے لوگوں کا تعاون کرنے کا ہمیں انکار نہیں، ساری دنیا اسے مانتی اور تسلیم کرتی ہے، میں بھی

بذاتِ خود اسے سراہتا ہوں؛ لیکن آخر یہ کونسی پارسائی ہے کہ گلستاں کو جب خون کی ضرورت پڑ رہی ہے، تو آپ نظریں چرا رہے ہیں، ایک کمزور وناتواں انسان ظلم کی چکی میں پس رہا ہے اور آپ خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں، یہی نہیں؛ بلکہ آپ دشمنوں کا ساتھ دے رہے ہیں، ان کے اشاروں پر کام کر رہے ہیں، مصر کی موجودہ حکومت نے تو ایسی دوغلی پالیسی اختیار کر رکھی ہے کہ ایک غیر جانبدار مؤرخ اسے کبھی بھی نظر انداز نہیں کرسکتا ہے، ایک طرف مصری حکومت اسرائیل وفلسطین کے درمیان امن کی بات کررہی ہے اور مذاکرات کے لیے کوشاں ہے، تو دوسری طرف مظلوم فلسطینیوں کے لیے اپنی سرحدیں بند کردی ہیں، وہاں تک پہونچنے والی غذاؤں کو روک دیا ہے، یہی نہیں؛ بلکہ ان کی خفیہ سرنگوں تک کو ڈھا دیا ہے، انہیں ان کے علاقوں میں قید کردیا ہے، فلسطین واخوان کی حمایت میں بات کرنے والے اپنے باشندوں کو دہشت گرد کہہ کر ملزم قرار دے رہی ہے، اس نے خود اسرائیل سے دوستی رچا رکھی ہے، اسرائیل مصر کے موجودہ غاصب صدر سیسی کو اپنا ہیرو تسلیم کرتا ہے، فیصلہ آپ خود کیجیے کہ اس پسِ منظر میں مصر کو مسیحا کہا جائے گا یا اپنوں کا دشمن۔۔۔۔۔!

سعودی عرب، کویت، بحرین اور عرب امارات وغیرہ کی سخاوت وفیاضی کا انکار نہیں، ان سب نے مسلم ممالک و تنظیمات کا بہت تعاون کیا، بالخصوص سعودی حکومت نے مختلف زبانوں میں قرآن کے ترجمہ کی طباعت اور حاجیوں کی خدمت کا جو بیڑا اٹھایا ہے اور خدمت کی ہے وہ لاجواب ہے، اگر چہ یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ اب سعودی نے حج کو بھی بہت مضبوط طریقہ سے اقتصاد سے مربوط کردیا ہے، جس کی وجہ سے حج وعمرہ کرنا عام لوگوں کے لیے بہت مہنگا ہوگیا ہے؛ لیکن افسوس صد افسوس اس پر ہے کہ آج خونِ مسلم کی اس ارزانی پر یہ مسلم ممالک خاموش کیوں ہیں؟ مضبوط قدم کیوں نہیں اٹھا رہے ہیں؟ اسرائیلی حکومت، یوروپی ممالک، امریکہ اور اقوام متحدہ پر یہ اپنا دباؤ کیوں نہیں ڈال رہے ہیں؟ حالیہ عرصہ میں اقوامِ متحدہ نے بیان کی حد تک ہی جب اسرائیل کی مذمت کردی ہے، تو اب اسے مزید ذمہ داری نبھانے پر مجبور کیوں نہیں کیا جارہا ہے کہ وہ مستقل جنگ رکوائے، آئندہ اس طرح بے گناہوں کے قتل سے زمین کو پاک رکھا جائے، اور اسرائیل ہمیشہ کے لیے غزہ کو اپنے وجود سے پاک کردے، کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں:

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اے مسلم حکمرانو! تم اتنے بے حس کیوں ہوگئے؟ ذرا غور تو کرو، کیا تمہارا یہ طور طریقہ اندازِ مسلمانی کا ترجمان ہے؟ خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے بعد تم میں احساسِ اتحاد کیوں نہیں پیدا ہوا؟ تم نے افغانستان پر امریکہ کے حملہ کو، عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کو اور فلسطین میں خون کی ہولی کھیلنے کو کیسے برداشت کرلیا اور کررہے ہو؟ کیا تم اپنی خاموشی کے ذریعہ یہود ونصاریٰ کو خوش کرنا چاہتے ہو، اگر جواب اثبات میں ہے تو ذرا اللہ تعالی کے اس قول کو ٹھیک سے پڑھ لو: ''اور نہ تو یہودی آپ سے راضی ہوں گے اور نہ نصاریٰ جب تک آپ ان ہی کے مذہب کی پیروی نہ کرلیجیے، آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اللہ کی ہدایت ہی اصلی ہدایت ہے، اگر آپ اس علم کے آجانے کے بعد بھی ان کی خواہشوں پر چلیں تو پھر اللہ کے غضب سے

آپ کو بچانے والا نہ کوئی دوست ملے گا اور نہ ہی کوئی مددگار'' (بقرہ:۱۲۰) اوراگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اہلِ کتاب سے دوستی کر لینے سے ہماری بادشاہت وحکومت ہمیشہ رہے گی، تو یہ تمہاری خام خیالی ہے، کتنی حکومتیں آئیں اور گئیں، حکومت دینا اور چھین لینا، یہ سب اللہ کی مشیت اوراس کے حکم سے ہے، ذرا قرآن کی اس آیت کو بھی پڑھ لو، نبی ﷺ کے ذریعہ ساری امت کو تعلیم دی جارہی ہے:''(اے پیغمبر! آپ اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردیجیے) اور کہیے کہ اے سارے ملکوں کے مالک، آپ جسے چاہیں سلطنت دیں اور جس سے چاہیں سلطنت چھین لیں، آپ جسے چاہیں عزت دیں اور جسے چاہیں ذلیل کریں (ہرطرح کی) بھلائی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے، بے شک آپ ہر چیز پر قادر ہیں''(آل عمران:۲۶)۔

اے میرے حکمراں بھائیو! چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری تو ازل سے ہی رہی ہے، ہمیں بہرصورت چراغِ مصطفوی کو روشن کرنا ہے، اسی میں جینا اور مرنا ہے، وہی ہماری کامیابی کا ضامن ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے ضمیر کو زندہ رکھیں، ایسا لگتا ہے کہ ہمارا ضمیر مردہ ہو چکا ہے، اسی لیے تو ہم ہر زخم کو پھول سمجھ کر چوم لیتے ہیں، اگر یہی صورتِ حال رہی تو ہمارا انجام ادبار ونکبت کے قعرِ مذلت کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا۔ بے باک داعی وعالم، مفکرِ اسلام مولانا علی میاں ندویؒ نے عالمِ اسلام کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے بہت اہم بات کہی ہے، اسی اقتباس کو نقل کر کے اپنی بات مکمل کرتا ہوں، مولانا لکھتے ہیں:

''اس وقت عرب قوم اپنی تاریخ کے انتہائی نازک اور اہم مرحلہ سے گذر رہی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ شکست کا مرحلہ ہے، یا مصیبت کا مقام ہے اور میں اس مصیبت سے خوف زدہ نہیں ہوں، دعوت اور پیغام کی حامل قومیں، طویل تاریخ رکھنے والی قومیں، زندہ ضمیر اور روشن اور زندگی سے بھرپور قلب رکھنے والی قومیں ان مراحل سے گذرتی ہی رہتی ہیں، ہم خود اس طرح کے بے شمار مراحل سے گذر چکے ہیں، ہمارے اوپر صلیبیوں نے یلغار کی، تاتاریوں کا طوفان ہمارے سروں پر سے گذر گیا، جب کہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں مسلمان کی آخری سانس بھی نہ رک جائے، پھر بھی وہ مایوسی اور بدشگونی کا مقام نہیں تھا؛ کیوں کہ مومن کا ضمیر زندہ تھا، مومن کی عقل باشعور تھی اور وہ خیر وشر، دوست ودشمن اور مفید ومضر کی تمیز کرسکتا تھا اور اس وقت مسلمان جری، صاف گو اور بہادر تھا۔

میں ان جیسے المیوں سے کوئی خطرہ نہیں محسوس کرتا؛ بلکہ مجھے اصل خطرہ اس ضمیر سے ہے، جس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہے، ضمیر کا کام ہے احتساب اور غلطیوں کی گرفت، خواہ وہ اپنے باپ اور بھائی سے سرزد ہوئی ہو، یا کسی ذی وقار پیشوا اور رہنما سے، اگر یہ ضمیر مردہ ہوجائے، اپنا فطری عمل چھوڑ دے، اپنی افادیت کھو بیٹھے اور اس میں حقائق کے اعتراف کی صلاحیت باقی نہ رہ جائے، تو یہی سب سے بڑا خطرہ ہے، یہ انسانیت کی موت ہے، ایک انسان مرتا ہے تو ہزاروں انسان پیدا ہوجاتے ہیں؛ لیکن جب ضمیر مردہ ہوجائے، اجتماعی اور قومی ضمیر سے زندگی کے آثار ناپید ہوجائیں، جب قوم سے محاسبہ کی صلاحیت اور جرأت ختم ہوجائے، جب تنقید واحتساب کی جگہ شاباشی اور دادِ تحسین کے پھول برسنے لگیں تو یہ ایسا المیہ ہوگا جس کے بعد کسی المیہ کا تصور ہی ممکن نہیں''۔

☆☆☆

تجزیہ

فلسطین میں کس کی جیت؟

احمد جاوید
ahmad.jawed@inquilab.com

مصر کی ثالثی میں حماس اور اسرائیل کے درمیان طویل مدتی جنگ بندی کا معاہدہ طے پایا اور منگل کی شام اس کے نفاذ کی خبر آئی تو بحیرۂ روم کی محصور آبادی فلسطین کے دونوں حصوں غزہ پٹی اور مغربی کنارے میں سڑکوں پر اتر آئی اور حماس نے بڑے پیمانے پر جیت کا جشن منایا۔ اسرائیل نے غزہ کا محاصرہ ختم کرنے کی اس کی پہلی شرط تسلیم کر لی ہے۔ اس لیے اہل غزہ کا یہ جشن فتح بے وجہ نہیں ہے۔ اسرائیل کے خلاف جنگ کے ہیروز کے ساتھ غزہ کے بوڑھے، جوان اور خواتین ہی سڑکوں پر نہیں نکل آئے، مغربی کنارے میں بھی بچے بوڑھے اور خواتین ہزاروں کی تعداد میں حماس کے پرچم اور شہداء کی تصاویر کے ساتھ گھروں سے نکل آئے۔ وہ صہیونیوں کے مظالم کے خلاف نعرے لگا رہے تھے، لیکن کیا یہ واقعی فلسطین کی جیت ہے۔ حماس کے لیڈروں اور مجاہدین کے عزم وحوصلہ کی فتح ہے اور کیا اسرئیل واقعی اب ایک شکست خوردہ ریاست ہے۔ اس پر بہت سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ فلسطینیوں کا عزم وحوصلہ اور ان کا صبر و استقامت ان کے پڑوسی عربوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے، لیکن کیا اس عزم وحوصلہ نے سچ مچ عرب اسرائیل تنازعہ کوئی کروٹ دے دی ہے اور اس مسئلہ کے حل کی نئی زمین تیار کی ہے؟ اول تو قاہرہ میں جنگ بندی کا جو معاہدہ طے پایا ہے اس کی کوئی ڈیڈ لائن مقرر نہیں کی گئی ہے۔ اسرائیل نے حماس کے اس مطالبے کے آگے گھٹنے تو ٹیک دیئے کہ اسرائیل غزہ کا محاصرہ ختم کرے، اب اسرائیل نہ صرف سرحدی کراسنگ کے ذریعے مزید امداد کی ترسیل اور مچھلیاں پکڑنے کے لئے سمندر میں چھ میل تک رسائی دے گا۔ بلکہ فریقین نے اس بات سے بھی اتفاق کیا ہے کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر متنازعہ فیہ معاملات پر مذاکرات کا آغاز کریں گے۔ جس میں اسرائیل کا یہ مطالبہ بھی شامل ہے کہ حماس کو غیر مسلح کیا جائے۔ اور حماس کا یہ مطالبہ بھی کہ محاصرہ کو وسیع بنیاد پر ختم کیا جائے، اور غزہ پٹی میں بندرگاہ اور ہوائی اڈے کو بحال کیا جائے۔ اس صورت میں یہ معاہدۂ امن کتنا پائدار ہے یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ اسرائیل اپنے گریبان میں منھ ڈالے گا اس کی توقع اس وقت تک نہیں کی جا سکتی جب تک کہ امریکہ اس کی غیر مشروط پشت پناہی جاری رکھے ہوئے ہے۔ گذشتہ دو

ہفتوں کے دوران جنگ بندی کے کئی معاہدے ہوئے جو پائیدار ثابت نہ ہوسکے، صرف عارضی وقفوں کا سبب بنے۔

دوسری طرف غزہ اسرائیل کی مسلط کردہ سات ہفتوں کی اس جنگ میں بائیس سو فلسطینی شہید ہوئے جن میں پانچ سو سے زائد بچے اور کثیر تعداد میں عورتیں شامل ہیں، دس ہزار سے زائد افراد زخمی بھی ہوئے ہیں جن میں سے بیشتر اب بھی موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور سینکڑوں افراد مستقبل میں کبھی اپنے قدموں پر کھڑے نہیں ہوسکیں گے، ہزاروں عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن گئیں۔ غزہ کا چالیس فیصد سے زیادہ حصہ ناقابل رہائش بن گیا۔ اسرائیلی جارحیت پسندی اور اس کی جنگی حکمت عملی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جنگ بندی کے نفاذ سے عین قبل اس نے غزہ سٹی کی کئی کثیر منزلہ رہائشی عمارتوں اور شاپنگ کمپلیکس کو میزائیلوں کا نشانہ بنایا اور ان حملوں میں ایک ۱۳ منزلہ رہائشی اور دفتر ٹاور کے علاوہ ایک ۱۶ منزلہ رہائشی عمارت تباہ ہوگئی۔ اس نے ان عمارتوں کو تباہ کرنے سے پہلے غیر آتشیں میزائیل داغ کر الرٹ کیا تاکہ لوگ عمارتوں کو خالی کردیں اور مرنے والوں کی تعداد ہزاروں میں نہ ہو کہ دنیا بھر میں ردعمل شروع ہوجائے۔ آخر اس قسم کے حملے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ بادی النظر میں یہ فلسطینیوں کی معیشت کی کمر توڑنے کی کاروائی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں یہ اسرائیل کی دہشت گردانہ کاروائی ہے جس کے دو مقاصد ہیں۔ اول تو فلسطینیوں کو دہشت زدہ کرنا، ان کے سامنے ان کے خویش و اقارب کی درجنوں لاشیں تڑپا دینا، دوسرے ان میزائیلوں کا تجربہ اور نمائش جن کو بیچ کر اسرائیل اور امریکہ اربوں ڈالر کمانا چاہتا ہے۔ ایک طرف امریکی وزیر خارجہ جان کیری مصالحت کاری کی کوششیں کرتے رہے، دوسری طرف امریکہ اسرائیل کو فلسطین میں وحشت و بربریت کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے ایندھن فراہم کرتا رہا۔ امریکی سینٹ نے اسرائیل کے میزائل ڈیفنس سسٹم 'آئرن ڈوم' کو مزید مستحکم بنانے کے لئے عین اس وقت ۲۲۵ ملین ڈالرز مختص کردیئے جب یہ جنگ تیسرے ہفتہ میں داخل ہورہی تھی۔ یہ رقم 'آئرن ڈوم' ڈیفنس میزائل سسٹم کی دوبارہ سپلائی اور انہیں غزہ کی پٹی پر اسرائیلی آپریشن جاری رہنے کی صورت میں تیار حالت میں رکھنے پر صرف کی جائے گی۔ ۲۰۱۱ء سے آپریشنل کیے جانے والے میزائل ڈیفنس سسٹم میں امریکا نے بڑے پیمانے پر سرمایہ لگایا تھا۔

اسرائیل نے اس بار جب غزہ پر چڑھائی کی تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے یہاں زمینی فوجی دستے داخل کرنے کے نتیجے میں پہلی بار بڑے پیمانے پر جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے سو سے زائد فوجی کام آگئے۔ اس سے پہلے ہمیشہ ایسا ہوتا آیا ہے کہ اسرائیلی فضائیہ بمباری کر کے فلسطینیوں کو بڑے پیمانے پر جانی ومالی نقصان سے دوچار کرتی تھی تاہم اس بار نتین یاہو حکومت نے اس خیال کے تحت زمینی فوج کو بھی فلسطین میں داخل ہونے کا حکم دیا کہ جب تک حماس کی سرنگوں کو تباہ نہ کیا جائے، تحریک مزاحمت کی کمر توڑی نہیں جاسکے گی۔ لیکن اسرائیل کی یہ چال الٹی پڑ گئی۔ اسرائیلی جارحیت کے جواب میں فلسطینی مزاحمت کاروں کے

راکٹ حملوں سے اسرائیلی معیشت اور صنعت کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔اس جنگ کے نتیجے میں صہیونی صنعت کے شعبے کو ۸۵۷ملین شیکل یعنی ۲۵۰ملین ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔اسرائیل کے زیادہ تر کارخانے وسطی اور جنوبی غزہ کے قریب مقبوضہ فلسطینی شہروں میں واقع ہیں۔فلسطینی مزاحمت کاروں کے جنگ کے پہلے روز سے ہونے والے حملوں میں صنعت کے شعبے کو غیر معمولی نقصان پہنچا۔صنعتی شعبے میں سب سے زیادہ منفی اثرات ملٹری صنعت پر پڑ رہے ہیں جس کے نتیجے میں اسرائیلی حکومت اور فوج سخت پریشانی کا شکار ہیں۔ اسی طرح مزاحمت کاروں کے راکٹ حملوں نے اسرائیلی ایئر پورٹ ویران کر دیئے، امریکہ سمیت پوری دنیا نے اپنی فضائی کمپنیوں کو اسرائیل کا رخ نہ کرنے کی ہدایت کر دی۔اسرائیل کو سیاحت کے شعبے میں غیر معمولی نقصان کا سامنا پڑا۔

برسوں پہلے حماس کے بانی سربراہ شیخ احمد یاسین شہید نے کہا تھا کہ ۲۰۲۵ءتک اسرائیل دنیا کے نقشے سے مٹ جائے گا۔لیکن اب یہی بات گزشتہ دنوں امریکی انٹیلی جنس رپورٹ میں بھی کہی جا رہی ہے۔صہیونی ریاست کے بارے میں امریکی انٹیلی جنس اداروں کی تیار کردہ رپورٹ ان دنوں پھر زیر بحث ہے، جس میں کہا گیا تھا کہ ۲۰۲۵ء میں دنیا کے نقشے میں اسرائیل نام کی کوئی ریاست نہیں ہوگی۔مقبوضہ فلسطین میں لاکر آباد کیے گئے لاکھوں یہودی ان ممالک کی طرف لوٹ جائیں گے جہاں سے آ کر وہ یہاں آباد ہوئے تھے۔رپورٹ کی تیاری میں امریکا کے ۱۶انٹیلی جنس اداروں نے حصہ لیا اور طویل بحث اور تجزیے کے بعد ''مابعد اسرائیل مشرق وسطٰی کی تیاری'' کے عنوان سے یہ رپورٹ جاری کی گئی ہے۔ واضح اور دوٹوک الفاظ میں پیش گوئی کی گئی ہے کہ اگلے دس سال میں مشرق وسطٰی میں موجود یہودی ریاست ''اسرائیل'' دنیا کے نقشے سے مٹ جائے گی۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ عرب ملکوں میں آنے والی نئی بیداری نے اسرائیل میں موجود یہودیوں کو سخت تشویش اور خوف میں مبتلا کر رکھا ہے وہ اپنے اور بچوں کے مستقبل کے حوالے سے سخت فکر مند ہیں۔یہی فکر انہیں واپس اپنے ملکوں کی طرف پلٹنے پر مجبور کر رہی ہے۔اسرائیل کے خاتمے کی پیش گوئی میں بتایا گیا ہے کہ لمحہ موجود میں یہودی آباد کاروں میں شرح ولادت کم ترین سطح پر آ گئی ہے جبکہ فلسطینیوں کے ہاں افزائش آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔اسرائیل میں مقیم ۵؍لاکھ یہودی آباد کاروں کے پاس امریکی پاسپورٹ موجود ہیں، جن کے پاس امریکی پاسپورٹ نہیں وہ یورپی ممالک کے پاسپورٹ رکھتے ہیں۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہودی آباد کار اسرائیل کے خاتمے کے بعد اپنے لیے کوئی الگ مملکت قائم کرنے کے بجائے دوسرے ممالک میں اقلیتوں کے طور پر رہنے کو ترجیح دیں گے۔اس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ برقرار ہے کہ کیا یہ واقعی حماس کی جیت ہے جس کا جشن فلسطین کے لوگ غزہ شہر کے ملبے پر اور شہیدوں کی لاشوں کے ساتھ منا رہے ہیں؟ جواب وقت کی کوکھ میں پل رہا ہے۔

☆☆☆

تصویرِ وطن

لو جہاد

کیا حقیقت ، کیا سراب

شمس تبریز قاسمی

نوٹ: یہ موضوع آج کل لوگوں کے درمیان بہت گردش کر رہا ہے، مذکورہ مضمون اس موضوع پر تشفی بخش معلومات اور اسلامی نقطۂ نظر پیش کر رہا ہے، اسی لیے اس کو شامل اشاعت کیا گیا، ویسے یہ محض ایک سیاست اور ایک سازش ہے جس کے نتیجہ میں اپنے طے شدہ پروگرام کو فروغ دینا، مسلمانوں کو پریشان کرنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اصل مسائل سے ان کی توجہ ہٹا کر انہیں اس جیسے موضوعات کے دفاع اور صفائی میں لگا دینا، اس سے بہر حال وہ اپنے مقصد میں بالکل کامیاب ہیں، کیوں کہ ہمارے طبقہ کے لوگ پورے طور پر اسی کے دفاع وصفائی میں لگے ہوئے ہیں، ظاہر ہے کہ کسی غیر مسلم خاتون سے شادی کی شریعت اجازت ہی نہیں دیتی چہ جائیکہ اسے ''لو جہاد'' کہا جائے اور اپنی رضا مندی سے کوئی اسلام قبول کر لے تو آئین ہند میں اس کی مکمل آزادی ہے، یہ کام دراصل RSS کا ہے، اس کا منصوبہ جواب تک راز میں رکھا گیا تھا وہ زبان پر آ گیا، RSS کا باقاعدہ پروگرام ہے اور اس کی بے شمار مثالیں ہیں کہ ایک مہم کے طور پر مسلم بچیوں کو شادی اور محبت کے جھانسہ میں پھنسا کر برباد کیا جاتا ہے، اپنی چال ہماری طرف منسوب کر دی اور ہم لگ گئے دفاع میں، حیرت تو تب ہوئی جب روز کوئی نہ کوئی دفاعی مضمون دیکھتے دیکھتے روز نامہ ''ہند نیوز'' جسے شاید کچھ فارغین مدارس ہی نکالتے ہوں، میں یہ عنوان دیکھا ''لو جہاد کے نام لیوا افراد کے منہ پر مسلم خواتین کا طمانچہ'' اس مضمون میں 84 خواتین کی فہرست درج ہے جنہوں نے ہندو سے شادیاں کی ہیں ان میں اکثریت ناچنے تھرکنے والیوں کی ہے، کچھ سیاسی گلیاروں کی پروردہ ہیں، افسوس ہوا اس سوچ اور اس انداز فکر پر، اول ان خواتین کا اسلام؟ پھر ہندو سے شادی کے بعد کا اسلام؟؟ اور یہ حرام کاری اس پر یہ فخریہ عنوان!! عقل سے کام لیا جائے تو صرف اتنا کہہ کر ان جیسے موضوعات سے منہ موڑ لینا کافی ہے کہ یہ خود RSS کا ایجنڈا ہے، اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں، باہمی رضا مندیوں کو بھی اسلام سے نہیں جوڑا جا سکتا اس لیے کہ اسلام میں شادی مشرکہ سے جائز ہی نہیں اور اگر کوئی اپنی خوشی سے مسلمان ہو کر کرے تو اسے جہاد کا نام دینا قطعی درست نہیں۔ (مدیر)

آر ایس ایس کی سیاسی شاخ بی جے پی نے مسلمانوں کے نزدیک گھیرا تنگ کرنے اور انہیں بد نام کرنے کے لئے ''لو جہاد'' کی اور نئی اصطلاح قائم کر لی ہے۔ انگریزی میں یہ لفظ "Love Jihad" ہے۔ اطلاع کے مطابق بی جے پی اسے اپنی متھرا میں منعقد ہونے والی میٹنگ کے ایجنڈے میں شامل کرنے والی تھی لیکن شدید ہنگامہ کے بعد اس نے فی الحال اسے موقوف کر دیا ہے۔ یہ لو جہاد کیا ہے۔ پہلے ہم اس کی تفصیل پیش کئے دیتے ہیں۔ بی جے پی کی اصطلاح میں لو جہاد نام ہے مسلم لڑکے کا غیر مسلم لڑکی سے شادی کرنا۔ یہ اصطلاح اتر پردیش میں پیش آنے والے ایک واقعہ کے پس منظر میں گڑھی گئی ہے۔ میرٹھ واقعہ کی سچائی یہ ہے کہ ہندو لڑکی نے از خود اسلام قبول کیا تھا اور ایک مسلم سے شادی بھی اس نے کی۔ یہی اس واقعہ کی سچائی ہے لیکن بھاجپا نے اسے غلط رخ دے کر پہلے وہاں فساد کیا اور اب مسلمانوں کے خلاف

ایک اصطلاح قائم کرکے یہ سازش شروع کی۔ یہ اصطلاح سب سے پہلے 2006 میں کیرالہ میں بی جے پی والوں نے شروع کی تھی لیکن ان دنوں اسے فروغ نہیں مل سکا۔ نہ ہی کوئی فرضی واقعہ گڑھنے میں وہ کامیاب ہوئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا یہ فتنہ کامیاب ہوئے بغیر نا کام ونامراد ہوگیا۔

بین المذاہب شادی کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ خود اسلام میں بھی اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت ہے۔ انگریزی میں بین المذاہب شادی کو Interfaith Marraige یا Mixed Marraige کہا جاتا ہے۔ بین المذاہب شادی کا وقوع عموما محبت کی شادی میں ہوتا ہے۔ بین المذاہب شادی کو لیکر ہمیشہ ہنگامہ کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ سلسلہ رکنے کے بجائے بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ بین المذاہب شادی کا رواج سب سے زیادہ امریکہ میں پایا جاتا ہے جہاں چالیس فی صد بین المذاہب شادی ہے۔ پاکستان میں بھی غیر مذہب کی لڑکیوں سے شادی کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ حالیہ دنوں میں پاکستان میں ایک ہفتہ سے مسلسل احتجاج کر رہے اور نیا پاکستان بنانے کا دعوی کرنے والے عمران خاں کی بیوی یہودی تھی جس سے اب ان کی جدائیگی ہو چکی ہے تاہم ان کے بچے اب بھی ان کی یہودی بیوی کی ہی گود میں پرورش پا رہے ہیں۔ پوری دنیا سمیت ہندوستان میں بھی بین المذاہب شادی کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ بالی ووڈ کے اداکاروں سے لے کر سیاسی لوگوں تک کی ایک لمبی فہرست ہے جن کی شادی دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والوں سے ہے۔ حیران کن امر یہ ہے کہ اس فہرست میں وہ لوگ شامل ہیں جو اسلام کے شدید مخالف مانے جاتے ہیں۔ چنانچہ بی جے پی کے قومی ترجمان سید شاہنواز حسین نے رینو سے شادی کی، جو ابھی تک ہندو ہے۔ سکندر بخت جن کے پاس اٹل بہاری واجپئی کی حکومت میں کئی وزارت تھی، نے بھی ایک ہندو لڑکی سے شادی کی جس کا نام راج شرما ہے، موصوفہ ابھی تک ہندو ہے۔ مختار عباس نقوی نے ایک ہندو لڑکی سے شادی کی ہے جس کا نام سیما ہے۔ بی جے پی کے سابق وزیر مرلی منوہر جوشی نے اپنی بیٹی کی شادی ایک مسلم نوجوان سے کی ہے۔ وشو ہندو پریشد کے شعلہ بیان و مسلم مخالف لیڈر اشوک سنگھل نے اپنی بیٹی کی شادی ایک مسلمان لڑکے سے کی ہے۔ اڈوانی جی کی بھتیجی نے ایک مسلم لڑکے سے شادی کی ہے اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ شادی کی ان تمام تقاریب میں اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن اڈوانی بنفس نفیس شریک رہے ہیں۔ بال ٹھاکرے کی پوتی نیہا ٹھاکرے کی شادی چند سال قبل ایک مسلم لڑکے سے ہوئی ہے۔ سبرامنیم سوامی کی بیٹی سہانی سوامی نے ایک مسلم لڑکے ندیم حیدر سے شادی کی ہے۔ سابق وزیر خارجہ سلمان خورشید کی بیوی لوئس خورشید عیسائی ہے۔ ہندوستان کے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کی بیوی موجودہ کانگریس صدر سونیا گاندھی بھی عیسائی ہے۔ فلمی دنیا کے سپر اسٹار شاہ رخ خان کی شادی گوری خان سے ہے، عامر خان کی پہلے رینا دتہ اور پھر کرن راؤ سے ہے، ارباز خان کی ملیکہ اروڑہ سے ہے، سلمان خان کا باپ سلیم خان ہیلن سے ہے اور سیف علی خان کی شادی کرینہ کپور سے ہوئی۔ مذکورہ تمام ہندو لڑکیاں آج بھی ہندو ہیں اور بخوشی اپنے شوہر کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہیں۔

اس کے علاوہ بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جنہیں

اپنی پسند کی شادی کرنے کے لئے مذہب تبدیل کرنا پڑا ہے، لگے ہاتھ اس کی بھی ایک مختصر فہرست دیکھ لیجئے۔ دلنواز شیخ کو سنجے دت سے شادی کرنے کے لئے ہندو بننا پڑا، ان کا موجودہ نام مانیتا دت ہے۔ فاطمہ رشید کو سنیل دت سے شادی کرنے سے پہلے ہندو بننا پڑا، اس کا ہندو نام نرگس دت تھا۔ بختیار مراد کو ہندی فلم ڈائریکٹر راجیو رائے سے شادی کرنے کے لئے سونم بننا پڑا۔ نیز مرزا جو آزاد ہندوستان کی پہلی مسلم مس انڈیا فائنلسٹ تھی کو شادی کرنے کے لئے نالنی پٹیل بننا پڑا۔ مشہور اداکارہ نفیسہ علی کو آر ایس سودھی سے شادی کرنے کے لئے ہندو بننا پڑا۔ عائشہ کو ممبئی کے لیڈر ارون گاؤلی سے شادی کرنے کے لئے آشا بننا پڑا۔ روشن آرا خان کو کون نہیں جانتا، موصوفہ موسیقی کے مشہور گھرانہ ''مہر'' کی بانی ہیں کو شادی کرنے کے لئے انا پورنا دیوی بننا پڑا۔ موصوفہ بعد طلاق بھی ہندو ہی رہی۔ بی جے پی کی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل اور سابقہ اداکارہ اسمرتی ملہوترا (اسمرتی ایرانی) پہلے ہندو تھی لیکن جب زبین ایرانی سے شادی ہوئی جو ایک ''آتش پرست'' ہے تو وہ خود بھی آتش پرست بن گئی۔ اب ان کے پروفائل میں مذہب کے کالم میں ''آتش پرست'' لکھا ہے نہ کہ ہندو۔ اس باب میں سب سے عجیب وغریب واقعہ ہیما لہ مالن کا ہے جنہیں اپنی محبت کو برقرار رکھنے اور من پسند شادی کرنے کے لئے مذہب تبدیل کرنا پڑا تھا کیوں کہ دھرمیندر سے انہیں محبت تھی۔ لیکن وہ اس سے شادی نہیں کرسکتی تھی کیوں کہ دھرمیندر پہلے سے شادی شدہ تھے اور ہندو مذہب کے مطابق دوسری شادی نہیں کرسکتے تھے تب ہیما اور دھرمیندر نے اسلام مذہب قبول کرکے شادی کی۔

بین المذاہب شادی کے اس بڑھتے ہوئے سلسلہ کو دیکھ کر اسے انسانی ضروریات میں شامل کرلیا گیا ہے ''عالمی اعلامیہ برائے حقوق انسانی'' نے اپنے موضوع میں اسے شامل کرکے۔ آرٹیکل 16 میں وضاحت کے ساتھ یہ ذکر کردیا ہے کہ مرد وعورت جو اپنے ملک میں رائج قانون کی رو سے بلوغت کو پہنچ گئے ہوں بلاتفریق رنگ ونسل، مذہب وشہریت کے اپنی پسند سے شادی کرسکتے ہیں۔'' بین المذاہب شادی کو دنیا میں بے پناہ فروغ مل رہا ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ اس طرح کی شادی مذہب اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے۔ یہ اسلام کے روح کے خلاف ہے۔ آر ایس ایس اور بی جے پی نے لو جہاد کی یہ اصطلاح قائم کی ہے مسلمانوں کے خلاف ایک سازش کا آغاز کرنے کے لئے، انہیں پریشان کرنے کے لئے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے حق میں ایک غیبی معاونت ہے۔ کیوں کہ قرآن میں غیر مسلم خواتین سے شادی کو ممنوع قرار دیا گیا اہل کتاب کی خواتین سے شادی کی اجازت ضرور ہے لیکن وہ بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ بی جے پی کی اس مسلم مخالف سازش کے بعد توقع ہے کہ مسلمان غیر مسلموں سے شادی کرنے سے اجتناب کریں گے۔ اس حرام امر کے ارتکاب سے اجتناب کریں گے۔ بی جے پی کی اس تحریک میں پس پردہ اسلامی تعلیمات کا فروغ ہے، احیاء شریعت ہے، مسلم نوجوانوں کو اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا درس اور پیغام دیا گیا ہے

☆☆☆

ادارے کے شب وروز

اداره

مدرسہ شوال میں دوبارہ کھلا اور اس نے اپنا تعلیمی سفر ایک نئی امنگ کے ساتھ شروع کیا، توسیعی خطبات کے لئے کئی حضرات سے درخواست کی گئی، جنہوں نے آئندہ آنے کا وعدہ فرمایا لیکن مشہور زمانہ ادارے دارالمصنفین سے وابستہ صاحب فضل وکمال محترم مولانا عمیر الصدیق ندوی صاحب حفظہ اللہ نے فوراً ہی ذمہ داروں کی حقیر دعوت قبول کرلی، مولانا محترم اس قدر خورد نواز، وسیع القلب اور متواضع ہیں کہ ان سے استفادہ کرنا ہر شخص کے لئے نہایت آسان ہے، یہ ازخود ایک مثالی وصف ہے جس کو اپنانا اور جزو زندگی بنانا یقیناً بہت مفید ہے۔

مولانا نے تین محاضرات دیے پہلے محاضرے کا عنوان تھا ''تحریک ندوۃ العلماء مقاصد وتعارف'' مولانا نے انتہائی فاضلانہ انداز میں اس طور پر طلبہ کے سامنے اس عنوان پر گفتگو کی کہ بزرگوں کا تذکرہ، تحریک کے مقاصد اور مقاصد کی افادیت اور پورا پس منظر سامنے آگیا، پھر مولانا نے اس تحریک کی پذیرائی اور افادیت کو بڑے پرکشش اسلوب میں بیان کیا۔

دوسرے عنوان ''مقاصد ندوۃ العلماء کو حاصل کرنے کے طریقے اور اسباب'' میں مولانا نے بڑی کامیابی کے ساتھ مختصر مگر جامع انداز میں اب تک کے سفر اور حصولیابیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اسی داستان میں وہ طریقے اور اسباب مضمر ہیں جن سے ان مقاصد کی حصولیابی ممکن ہے، ندوۃ العلماء کے مقاصد کی حصولیابی میں جن لوگوں کا بھی حصہ ہے ان کے یہاں ایثار، فنائیت، رضائے الٰہی کی طلب اور اعتدال نمایاں نظر آتا ہے، یہ اور ان جیسے عناصر نے ہی مولانا مونگیریؒ، ان کے رفقاء پھر بالخصوص علامہ شبلیؒ سے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ تک فرزندان و بانیان ندوہ میں ایسی تڑپ پیدا کی جس نے انہیں اپنا سب کچھ تج دینے پر آمادہ کیا۔

تیسرے عنوان ''ندوۃ العلماء کا علمی دعوتی مزاج'' پر انتہائی جامع اور مفصل محاضرہ پیش کیا جو انشاء اللہ مقالہ کی شکل میں آئندہ کسی اشاعت میں شامل ہوگا، مولانا نے فرمایا کہ علامہ شبلی نے دعوت کو موجودہ تبلیغی جماعت کی شکل کے وجود میں آنے سے بہت پہلے اسی صورت میں طلبائے ندوہ کے لئے تجویز کیا تھا، پھر جب مولانا الیاسؒ کی یہ تحریک وجود میں آئی تو خود مولانا عمران خاں صاحبؒ اور مولانا علی میاںؒ نے دعوت کے اس طریقۂ کار کو نہ صرف ہندوستان بلکہ ملک سے باہر بھی متعارف کرایا، ندوہ کے علمی اور دعوتی مزاج پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ندوۃ العلماء کا امتیاز یہ ہے کہ اس کے فرزندوں نے اپنی بات کہنے اور اعتراضات کا جواب دینے نیز وقت کے تقاضوں کے مطابق لٹریچر تیار کرنے میں حوالوں کے التزام کی طرح ڈالی اور مستشرقین کو ان ہی کے انداز میں اس طرح جواب دیا کہ معترضین خاموش ہوگئے، اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے خاص طور پر دارالمصنفین اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کا جامع تعارف کرایا اور بعض کتابوں کی اشاعت وتصنیف کے پس منظر اور اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی، ادارہ کا ایک ایک فرد مولانا کے قیمتی محاضرات اور نئی روح پھونک دینے کی اس کوشش پر ان کے لئے سراپا تشکر بن گیا، امید ہے کہ نظر ثانی کے بعد مولانا ان تینوں محاضرات کو بالخصوص تیسرے عنوان کو مقالہ کی شکل دے کر ندائے اعتدال کے ذریعہ تمام وابستگان ندوہ کو فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کریں گے۔

ادارہ اس طرح کا ارادہ رکھتا ہے کہ امسال ندوۃ العلماء سے ملحق کم از کم یو، پی کے تمام اداروں سے عربی، اردو تقریر و مقالہ نگاری اور بیت بازی کے لئے مقابلہ میں شریک کرے اور مقالہ نگاری کا یہی تیسرا عنوان رکھے، کہ اپنی تحریک، اپنی تاریخ اور اپنے مرکز کے متعلق معلومات عام اور تازہ ہوسکیں، خدا کرے کہ ادارہ اپنے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو، واللہ الموفق والمستعاں۔

آخری صفحہ

سر سید احمدؒ کی اسلامی غیرت

سر سید احمد خاں کے زمانے میں سر ولیم میور مغربی وشمالی مما لک کا لفٹنٹ گورنر تھا۔ اس نے ۱۸۶۶ء میں ''لائف آف محمد'' کے نام سے ایک کتاب چار جلدوں میں لکھی اور اسلام اور شارع اسلام کے متعلق ایسا زہر اگلا کہ عیسائیوں کے خیال میں اس کا کوئی جوب نہ ہوسکتا تھا۔ سر سید احمد خاں نے باوجود سرکاری ملازم ہونے کے اپنے صوبے کے سب سے بڑے حاکم کی کتاب کا جواب لکھنے کا ارادہ کیا۔

چونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی کے قدیم کتب خانے ضائع ہو چکے تھے اس لئے وہ اپنے بیٹے سید محمود کے ہمراہ ولایت چلے گئے جہاں انڈیا آفس کے کتب خانے اور برٹش میوزیم کی لائبریری سے ان کو بہت سا مواد ملا باوجود مالی مشکلات کے دل کی جلن کا یہ حال تھا کہ قرض لیا، دوستوں سے روپیہ منگوایا اور اپنے گھر (دہلی) لکھدیا کہ میرا اسباب یہاں تک کہ تانبے کے برتن تک بیچ دو اور روپیہ روانہ کرو۔

آخر اس زہریلی کتاب کا جواب خطبات احمد یہ کے نام سے چھپوایا ان کے اکثر دوست جاگیر دار اور سرکاری عہدہ دار سرولیم میور کی گورنمنٹ کے ماتحت تھے ان سب نے ان کو منع کیا مگر انہوں نے کسی کی نہ سنی۔

سر سید احمد خاں ہی کے ایک عزیز کو ایک مرتبہ ایک ایسے متعصب افسر سے سابقہ پڑا جو ان کی نماز پر اعتراض کرتا تھا اور نماز کی رخصت نہ دیتا تھا، آخر انہوں نے ڈر کے مارے نماز چھوڑ دی اور سر سید کو سارے حالات کی اطلاع دی۔ سر سید احمد خاں کا غیرت و حمیت سے بھرا جواب سنئے۔

آپ نے جواب دیا:

''کہ نماز جو خداوند کریم کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے جس خرابی سے ادا کریں یا قضا کریں لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو اس کا صبر ایک لحہ بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جاسکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی کرنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری میسر نہ ہوتی فاقے سے مرجاتے نہایت اچھا تھا''

غرض سر سید احمد خاں اپنے بعض بلکہ بہت سے مذہبی خیالات میں آزاد تھے لیکن مذہبی خیالات میں آزاد ہونے کے باوجود غیروں کے سامنے اپنے مذہب اور اپنی قوم کے حق میں دلیر، نڈر، جری اور بہادر تھے ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا افسوس ہے کہ ان اوصاف کی روز بروز کمی ہوتی جارہی ہے۔

آج ہم میں سے اکثر سر سید احمد خاں کی ان تحریروں اور تفردات کی بنیاد پر ان پر کفر وفسق کا فتوی لگانے میں نہیں چوکتے جو بشری تقاضے کی بنیاد پر ان سے سرزد ہوئے اور بہت ممکن ہے کہ انہوں نے ان مفردات سے رجوع کرلیا ہو جیسا کہ بہت سے ان کے متعلقین کا خیال ہے۔ لیکن ہم میں سے کتنے ہیں جو سر سید احمد خاں کی طرح اسلام اور ارکانِ اسلام کے بارے میں اتنے حساس اور غیرت مند ہیں جتنے وہ تھے آج ہم اسلام کی دفاع میں کیا کچھ کررہے ہیں؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ہر شخص اپنے ضمیر سے پوچھنا ہے اور اپنا احتساب کرنا چاہیے۔ ☆☆☆

(م۔ق۔ن)